



# مفکر

تالیف:

محمد شریف سیالوی

4212

ناشر:  
ادارہ تعلیمات اسلامیہ، راولپنڈی (رجسٹرڈ)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

علمی، فیکری و اصلاحی مضامین کا مجموعہ

# موجِ فکر

تالیف

محمد شریف سیالوی

ایم اے، ایل ایل بی، ایل ایل ایم

ناشر

ادارہ تعلیمات اسلامیہ (سرگودھا)

پوسٹ بکس ۸۶۹، راولپنڈی

۱۹۹۱

فون: ۰۱۱-۲۶۱۱۱۱

نام کتاب \_\_\_\_\_ موج فکر  
 نام مصنف \_\_\_\_\_ محمد شریف سیالوی، ایم اے ایل ایل بی، ایل ایل ایم  
 کتابت \_\_\_\_\_ افضل مینر  
 سال اشاعت \_\_\_\_\_ اپریل ۱۹۸۲ء  
 تعداد \_\_\_\_\_ ایک ہزار  
 ناشر \_\_\_\_\_ ادارہ تعلیمات اسلامیہ (رجسٹرڈ) راولپنڈی  
 قیمت \_\_\_\_\_ چھ روپے

### بنیادی عقیدہ

اللہ ہمارا رب ہے اور منزہ عن العیوب ہے۔  
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور معصوم عن الخطا ہیں۔  
 قرآن مجید خدا کی کتاب، ہمہ ارضابطہ حیات اور بے عیب کلام ہے۔



انسان خطاؤں اور لغزشوں کا پتلا ہے۔ اس حیثیت سے بہر حال یہ امکان رہتا ہے کہ وہ  
 لکھتے ہوئے پھسل جائے۔ اگر آپ اشارتاً یا صراحتاً کسی بھی انداز میں ہمارے  
 درج بالا بنیادی عقیدہ کو مجروح ہوتا ہوا پائیں تو اس کو ہماری ذاتی کمزوری متصور کرتے ہوئے  
 قلم زد کر دیجئے۔ ہم اپنی عزت، مقام اور جھوٹی انا کے مقابلہ میں ایمان کو بہ صورت  
 ترجیح دیتے ہیں۔

# فہرست مضامین

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۵	قرآن اور تصورِ عدل	۱
۱۵	ادی برحق اور تربیتِ نفس	۲
۲۰	تصورِ حکمت	۳
۲۶	نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم — چند بنیادی اصطلاحیں	۴
۳۲	نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم — معاشی نظام	۵
۳۳	نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم — خارجیہ پالیسی	۶
۵۲	اسلام کا نظامِ تعلیم	۷
۶۵	شخصی ملکیت اور حقِ ریاست	۸
۷۴	اسلامی نظامِ حکومت اور خلفائے راشدین	۹
۸۲	پردہ — اخلاقی و نفسیاتی ضرورت	۱۰
۹۰	قانون اور احترامِ قانون	۱۱
۹۷	بیمہ اور اس کی شرعی حیثیت	۱۲

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زیر نظر مجموعہ مضامین زماں طالب علمی کی یادگار ہے۔ جن میں سے بعض "ترجمان اہلسنت" اور "سوتے منزل" میں شائع ہوئے ہیں۔ اکثر ایسے مضامین ہیں جو طلبہ سناٹیوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ گو تحقیق کے اعتبار سے مضامین خاصے تشنہ ہیں، لیکن بائیں ہمہ تنوع اور اسلوب کے لحاظ سے طلبہ کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔

میں ارباب ادارہ تعلیمات اسلامیہ کا انتہائی ممنون ہوں۔ جن کی مخلصانہ مساعی اور علم دوستی سے یہ مجموعہ زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اللہ رب العزت اپنے محبوب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل فکر صانع اور نیک عمل کی توفیق بخشے۔ "آمین"

احقر العباد

مُحَمَّدُ شَرِيفُ سَيَّالُوكِ

ایم۔ ایل۔ ایل بی بی ایل ایل ایم۔

اسلام آباد

۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء

# قرآن اور تصدو عدل

کہ ارض پر حصول انصاف سے بڑھ کر کوئی ضرورت نہیں۔ داد رسی اور عدل گسٹری سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں۔ وہی خیر الامم ہے جو قیام عدل و انصاف کے عظیم مشن پر مامور ہے جس کا آئین فندگی عدل کی حکمرانی اور تنگ و تازہ حیات کا مرکز قانون عدل کا نفاذ ہے۔

نظام اسلام \_\_\_\_\_ نظام عدالت ہے

اور امت مسلمہ \_\_\_\_\_ امت شہادت ہے

ملت اسلامیہ بحیثیت ”خیر امت“ ”شہادت“ کا تاج کرامت سجانے عدل و انصاف

گو برپا کرنے کے لیے منجانب اللہ مامور ہے۔ قرآن عظیم پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ این تڈھوں

ان ہوا لا ذکر للعالمین (۸۲-۲۶-۲۷) تم کہاں جا رہے ہو۔ سرچشمہ حکمت تمہارے سامنے ہے

اس کی موجودگی میں تشنہ لبی کا عالم باعث حیرت و استعجاب ہے۔ قول و فعل کے تضاد نے تمہاری

شخصیت میں جگاڑ پیدا کر دیا ہے۔ افراد کی شخصیت (PERSONALTY) جب خواہشات نفس سے

ایک طرف جھک جاتی ہے۔ عقل و فہم توازن قائم کرنے کے لیے مناسب اقدام نہیں کرتے۔ تو پورا معاشرتی

ڈھانچہ غیر متوازن ہو کر رہ جاتا ہے۔ بے انصافی کی یہ کیفیت تمام برائیوں کی جڑ اور ظلم و فساد کی بناء

ہے۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ اس ناہمواری اور ظلم و تعدی کی کیفیت کو قانون عدالت کے نفاذ

سے دور کیا جائے۔ نظام عدالت اسلام اس کی مکمل طور پر ضمانت دیتا ہے۔

اس سے قبل کہ نظام عدالت اور قیام انصاف کے موضوع پر اسلام کا نقطہ نگاہ پیش کیا جائے

ٹھہری اور عقل بنیادوں پر نظریہ عدل (CONCEPT OF JUSTICE) کی تحلیل ضروری ہے۔ عدل

کے لغوی معنی ایسی برابری کے ہیں جو توازن پر مشتمل ہو۔ قدیم عربی ادب میں عدل البعیر سے مراد

وہ سامان لیا جاتا تھا۔ جو اونٹ کی پیٹھ پر لادا جاتا اور اس کی دونوں جانب برابر برابر جوتی۔  
 دو سرائیڑھی لکڑی کو گرم کر کے بھاری پتھر کے ذریعے سیدھا کرنے کے لیے عدل کا لفظ استعمال کیا  
 جاتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خطبہ خلافت میں فرمایا۔ اذ املت عدلونی کما یعدل السهم  
 فی الثقبان (تاج العروس۔ عدل) اگر میں کج روی اختیار کروں تو مجھے ایسے سیدھا کر دو۔ جیسے تیر  
 مضبوط بھاری پتھر کے نیچے رکھ کر سیدھے کیے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں عدل اور اس کے مشتقات کثرت سے استعمال ہوتے ہیں ماہرین لغت  
 قرآن اور مفسرین کرام نے سیاق کے اعتبار سے جو معانی مراد لیے وہ یہ ہیں۔

۱۔ توازن ۲۔ تناسب ۳۔ تاوان ۴۔ ٹھیک ۵۔ صاف واضح ۶۔ ہم آہنگی ۷۔ انصاف  
 ۸۔ مساوات برابری۔ قرآن مجید میں عدل کے مرادفات (ہم معنی) اور اس کے قریبی مضمون میں  
 القسط، الوسط، المیزان، اعتدال، مستقیم، قسطاس، تقدیر اور ان کے مشتقات وغیرہ ہیں۔  
 قرآن مجید کے اسلوب بیان اور ان شواہد سے جو نظریہ عدل سمجھ میں آتا ہے اپنے اجزائے  
 ترکیب اور ماہیت کے اعتبار سے جملہ مذکورہ معانی پر محیط ہے۔ یہی قرآن مجید کا اعجاز ہے اور  
 یک ایک کلمہ علم و معرفت اور دانش و بینش کا بحر عمیق ہے۔ علماء کرام نے اس تصور عدل کو  
 وضع النبی فی موضعہ ترجمہ: کسی چیز کا اپنی جگہ میں رکھنا، تعبیر کیا۔ یوں عدل سنتہ الہیہ ہے۔  
 یہ کلمہ ہی ذات ہے جس نے کائنات کو تخلیق فرمایا۔ ہر چیز کو اس کی مناسب ترین جگہ  
 (FITTEST PLACE) پر رکھا۔ ایک کامل ہم آہنگی اور توازن کو ہوں روح کائنات بنایا۔

☆ "SUITABLE THING FOR A SUITABLE PLACE" ایسا چیز ہے جو افراد کی

حیثیت و صلاحیت کی نسبت اس کا معاشرہ میں مقام تعیین کرنا ہے تاکہ اجتماعی توازن پر قرار رکھا جائے  
 اور وہ کام مقرب ہے جس کا کام اسی کو سا جھے "وضاحت و بلاغت عبادت وضع الکلام موضع سے یعنی  
 مقتضائے حال اور موقع و محل کی مناسبت سے زبان و بیان کا استعمال۔ علم حیاتیات Biology

میں (SURVIVAL OF THE FITTIEST) قانون قدرت مانا جاتا ہے۔ القرآن و انبیئنا فیہا من کل  
 شئی موزون۔ ترجمہ اور اس میں ہر چیز اندازے سے آگاہی (۱۵-۱۹)



۷۔ آسمان کی بلندی زمین کی وسعت، رات کا آنا اور دن کا جانا، ہواؤں کا چلنا اور بادلوں کا برسنا، بچھوں اور کلیوں کا چٹھکنا، سورج کی ضیا پاشیاں اور آفتاب کی نورباریاں، رونق بانات اور طائرانِ خوشنوا، شہد کی مکھی کا انہماک اور مرغانِ صبحگاہی کی خوش الحانیاں، کس کس منظرِ قدرت باری کا تذکرہ کیا جائے۔ کس نعمت کو آخری آیت قرار دیا جائے، کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اُس کی حکمت کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ کتاب ہستی کا کوئی ایسا ورق نہیں جہاں اس کے عدلِ کوینی شواہد نہ ہوں، اپنی نگاہ دوڑا لیجئے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ چھان ماریئے۔ افلاک و اجرام میں سے ہر ایک کا مشاہدہ کیجئے کیا تمہیں کہیں بگاڑ نظر آتا ہے۔ کیا عدم توازن کا روگ دکھائی دیتا ہے۔ بدظنی اور اعتدال سے انحراف کا نشان ملتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ایک کامل ہم آہنگی، مکمل توازن اور افراط و تفریط سے مبرا، کائنات کا ہر جزو قانونِ عدل کی نگرانی میں اپنے کل کے ساتھ مل کر مصروفِ کار ہے۔

قرآنِ عظیم بار بار دعوت دیتا ہے کہ تروی فی خلق الرحمن من تفویتہ فارجع البصر هل تروى من طور۔ ترجمہ تو الرحمن کے بنانے میں کیا فرق دیکھتا ہے تو نگاہ اٹھا کر دیکھ کوئی رخنہ نظر آتا ہے۔

۶۷-۶۸۔ عظیم خدا کی عظیم کائنات قانونِ عدل کی تابع ہے۔ عدلِ کوینی کے ان کونیائی مظاہر پر غور و فکر کے علاوہ انسان کی ذات میں غلط زنی کی دعوت دیتے ہوئے قرآنِ مجید فرماتا ہے۔

وفی انفسکم افلا تبصرون: ۵۰۔ ترجمہ: اور خود تم میں، تو کیا تمہیں سوجھا نہیں۔

تخلیقِ انسان کا وقت آیا۔ اسے حسین صورت اور فضل و علم عطا کیا۔ بحر و براس کے زیرِ نگین کیے۔ شرافت و کرامت کا تاج اُس کے سر پر رکھا اور اپنے قانونِ عدل سے اُس کے اجرائے ترکیبی میں حسین امتزاج اور خوبصورت توازن پیدا کیا۔ تعجب ہے کہ انسان قانونِ عدل سے انعام برت کر خواہشاتِ نفس کی طرف جھک جاتا ہے اور اپنی شخصیت کا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ اللہ کریم اپنے اسی بندے کو کمالِ رحمت سے اس نقصان اور دھوکے سے خبردار کرتا ہے: یا ایھا الانسان

ماغشک بربک الکریم الذی خلقک فسوک فعدلک ہ فی ای صورۃ ما شاء رکبک (القرآن، ۸۶: ۷۶)

ترجمہ:۔ اسے آدمی تجھے کس چیز نے فریب دیا۔ اپنے کرم والے رب سے جس نے تجھے پیدا کیا۔ پھر ٹھیک بنایا۔ پھر مہوار فرمایا۔ جس صورت میں چاہا تجھے ترتیب دیا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قانون عدل سنت خداوندی ہے۔ کیونکہ وہی صحیح معنوں میں "عادل" ہے اس کی سنت اور اس کا قانون اہل اور غیر مقبل ہے۔ وَلَا تَجِدُ شَيْئًا تَحْوِيلًا (القرآن - ۱۷۷، ۱۷۸) ترجمہ: اور تم ہر قانون بدلتا نہ پاؤ گے۔

جس طرح تخلیق و تکوین میں قانون عدل صرف اور صرف خدا تعالیٰ ہی کا کار فرما ہے اسی طرح تشریحی امور میں بھی قانون عدل اسی ذات کبریا کا واجب النفاذ ہے۔ خلق و امر دونوں پر قانون سازی اور حکمرانی کا استحقاق بھی اسی ذات واحد و یکتا کے لائق ہے۔ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ (القرآن ۵۷-۵۸) ترجمہ: حکم نہیں مگر اللہ کا۔ امر خداوندی اور سنت الہیہ جو کائنات کے نظم و نسق اور ربط و ضبط کے ضمن میں جاری ہے۔ قانونِ فطرت (NATURAL LAW) پر مبنی ہے جو مکمل توازن کامل ہم آہنگی عظیم توافق باہمی اور حسین اعتدال سے عبارت ہے اور وہ اولہر جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اخلاقی قدروں کو متعین کرتے ہیں۔ اخلاقی منوالی قوانین NORMATIVE ETHICAL LAWS کہلاتے ہیں۔ جیسے کائنات کی حیات و بقا، قانونِ عدل کی اتباع میں ہے۔ انسانی فوز و فلاح اور حقیقی حیات بھی قانونِ عدل کو تسلیم کر لینے میں ہے۔ اس عدل کی نسبت سے اخلاقیات اور سیاسیات، عمرانیات اور اقتصادیات الگ الگ قانون میں نہیں بٹ جاتے بلکہ یہ سب مل کر ایک گل بناتے ہیں۔ اس قانون کے سامنے انفرادیت اور اجتماعیت کی دھڑ بندیاں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اخلاق اور قانون ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

انسان دوسرے موجودات کائنات سے ایک اعتبار سے مختلف ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حریت، ارادہ اور آزادی عمل دی کتاب عدل (قرآن مجید) اور انبیاء کرام کے قدیم حق و باطل کے امتیاز کی دولت مرحمت فرمائی اور کہہ ارض کے مکینوں سے فرمایا کہ هٰذِيْنَ السَّبِيْلَاتَا شَاكِرًا وَاِذَا كَفَرًا (القرآن) ترجمہ: ہم نے اُسے راہ بتائی۔ یا حق ماننا یا ناشکری کرنا (۷۶-۷۷)

یہ محدود آزادی ارادہ اور قدرت کسب فعل کی حدود میں مختلف جذبات و میلانات عقلی اور نفسی عوائد و رجحانات میں قانون اور اعتدال صرف اور صرف قانون عدل کے نفاذ سے ہو سکتا ہے جس کا منبع اور مصدر بھی تکوینی عدل کی طرح اللہ کی منشا ہے۔ مرضی رب ہی قانون بنتی ہے۔ قانون کی اتباع مرضی رب کے حصول کا ذریعہ اور اپنی ذات اور معاشرہ میں توازن و اعتدال برپا کرنے کا سبب ہے۔ یاد رہے کہ قانون الہی (DIVINE WILL) عدل سے عبارت ہے اور عدل حسن (BEAUTY) اور صداقت (TRUTH) دونوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ جیسے تخلیق اور حسن، عدل اور حسن کو ایک دوسرے کا مکمل قرار دیا گیا ہے۔

یعنی جو حکم خداوندی ہے خواہ وہ کو نیاتی ہو یا اخلاقی اپنے اندر حسن بھی رکھتا ہے امام اشرفی رحمۃ اللہ علیہ کے نقطہ نظر سے یوں کہا جائے کہ حسن و قبح کا معیار حکم الہی ہے۔ عقل کو تاہ حسن و قبح کا معیار نہیں بن سکتی۔ (۱) حسن و قبح کا معیار عقل یا شرع۔ بحر العلوم و شرح مسلم النبوت۔ الشاطبی : الموافقات۔ الأمدی، الاحکام۔) انسانی فکر و ناسانے اس مرحلہ پر بڑی قلابازیاں کھائیں کسی نے لذت کو حسن علی قرار دیا کسی نے موافقت مال کو اور کسی نے عقل محض کو (۲) انسائیکلو پیڈیا آف

ایٹھلس اینڈ ایتھس۔ زیر عنوان GOOD (خیر) جی۔ اے۔ مور۔ PRINCIPA OF ETHICA

میکنزی: AN MANUAL OF ETHICS: لٹی پروفیسر: (AN INTRODUCTION TO ETHICS)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نظریات انسانی معاشرہ کو کبھی خیر و فلاح کی نوید نہ دے سکے بلکہ ہولوں کہ ان عقائد کی اڑ میں حرص و داز اور شہوت رانیوں کو کھل کھینے کا موقع ملا۔ یہ بحث اپنی جگہ تفصیل طلب ہے کہ اخلاقیین کے خیر و شر کے بارے میں ان نظریات سے انسانیت نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہاں مسئلہ صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حسن و خیر کا منبع بھی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو کیوں نہ کہا جائے۔

تعز من تشاء و منزل من تشاء بیدك الخیر انك علی كل شیء قدير (القرآن) ترجمہ: جسے چاہے  
تو دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے۔ بے شک تو سب  
کچھ کر سکتا ہے (۲۱-۲۰) حق اور صداقت قطعاً کیا ہے؟ یہاں بھی انسان نے بڑی ٹھوکریں

کھائیں اور کئی نظریات پیش کیے۔ جن سے انسانی زندگی کے مسائل سے کوئی گتھی سلجھ تو نہ سکی البتہ الٰہی ضرور گئی۔ قرآن مجید صداقت کا تعلق عدل سے قائم کرتے ہوئے منشاء الٰہی کو قانون حیات انسانی قرار دیتا ہے۔

والقرآن ترجمہ :- اور پوری ہے تیرے رب کی بات بیح اور انصاف میں اس کی باتوں کا کوئی بدلنے والا نہیں (۲ - ۱۱۴) عدل کی ماہیت اس لحاظ سے صدق اور حسن کے ساتھ تکوین ہوتی ہے۔ افراط و تفریط سے سب سے بڑا ہونا اور بقاضائے فطرت انسانی نقطہ اعتدال منشا قانون عدل ہے۔ وسط اور استقامت صفت اعتدال کے لازمی اجزا ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو امت وسط قرار دیا۔

اُمّت وُسطًا لَتکونوا شهداء علی الناس (۲ - ۱۴۳) (ترجمہ :- میں امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو) اور طریقہ صالحین، مقربانِ بارگاہِ خداوندی کو صراطِ مستقیم کہا جسے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "ما انا علیہ واصحابی" کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ یہ راہِ ہدایت "مسکِ اعتدال" ہے جو سنتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جماعتِ صحابہ علیہم الرضوان سے عبارت ہے۔ وہ عظیم صحابہ جن کو اللہ کے رسول نے تمغہ عدالت دیتے ہوئے جاوہِ منزل تک رسائی کا زبردست ذریعہ بتایا۔

اصحابی کالنجوم یا یعم اقتدیتم اھتدیتم (مشکوٰۃ المصابیح فی مناقب الصحابہ) ترجمہ :- میرے اصحابی تاروں کی مانند ہیں جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ غرضیکہ قرآن مجید کا تصور عدل ایک اُفاتی اور ہمہ گیر اصل ہے۔ جو کائنات اور انسانی معاشرہ کے بقا و دوام اور امن و امان کی ضمانت دیتا ہے۔

انسان کی انفرادی زندگی کے جملہ پہلو قانونِ اعتدال کی میزان پر تولے اور پرکھے جاسکتے ہیں ایک نفسیات کے طالب علم کے لیے یہ سمجھنا زیادہ دشوار نہیں کہ انسانی شخصیت کے عناصر ترکیبی اس کے جلی بھجانات "طبعی میلانات اور عقلی و نفسانی خواہشات ہیں۔ فریڈ کے نظریہ جنس (SEX) کی رو سے شہوانی خواہشات کے منہ زور گھوڑے انسان کو بے راہ رو کر دیتے ہیں۔ ایسے میں ان محرکات کے اندر اعتدال و توازن کا قیام انسانی شخصیت کی بقا کا واحد راستہ ہے۔ امام غزالی علیہ الرزق اخلاق کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ عالم سفلی کی ترکیب چار چیزوں پر ہے۔

یعنی خون، بلغم، صفرا اور سودا ان کے نیلے ایک حد اعتدال مقرر ہے۔ علم طب اسی اعتدال سے آگاہ کرتا ہے۔ تاکہ اسے بیماری اور ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے۔ روح انسانی کے لیے بھی حد اعتدال مقرر ہے۔ جس کی نگہداشت کرنے کے لیے علم اخلاق و ریاضت ہے تاکہ اسے اعتدال پر رکھے اور اس کی صحت کا سبب بنا رہے (کیہلئے سعادت، یعنی انسانی شخصیت مستحکم ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ وہ غصہ، شہوت، رحم اور انتقام محبت و نفرت کے تضاد جذبات و احساسات کسی کو کسی پر غالب نہ آنے دے۔ ان میں توازن صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ انہیں ایک عالمگیر قانون کے تابع کر دیا جائے اور قانون بھی اُس کا جس نے یہ قوتیں انسان کو ودیت کی ہیں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ انسان کو پیدا کرنے والا انسان کی فطرت اور اس کے تقاضوں سے زیادہ باخبر ہے۔ لہذا اسی کا قانون عدل انسان کے عالم نفس میں بھی عدل کی حکمرانی قائم کر سکتا ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش میرے حکم کے تابع ہو، ﴿المصابیح منہ ۳﴾ ترجمہ: اس کی خواہش میرے حکم کے تابع ہو، یعنی دین مصطفیٰ۔ دین عدل ہی میزان شخصیت میں روح و مادہ، دین و دنیا، عقل و شہوت، محبت و نفرت کے پلٹروں کو برابر رکھ سکتا ہے۔ قرآن مجید نے روحانی اور مادی مسرتوں میں راہ وسط اختیار کرنے کی تعلیم دی۔ دین کے ساتھ دنیا کی بھلائی طلب کرنے کا درس دیا اور خدا سے مانگنے کا انداز یوں بنایا۔ ”ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النار“ عبادت کے ساتھ معاشی جدوجہد کا کتنا حسین امتزاج ہے۔ ادھر نماز جمعہ سے فارغ ہوئے ادھر حکم ہوا۔

فانتشرو فی الارض و ابشغوا من فضل اللہ (سورہ جمعہ آیت ۶۲-۱۰) ترجمہ:۔ تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ معاملات دین و دنیا اور فکر معاش و معاویہ میں عدل قائم رکھنے کی کتنی عمدہ تعلیم ہے جو ان دو پلٹروں کو متوازن نہ رکھ سکا اللہ کسی ایک کی طرف مائل ہو گیا تو اس کی شخصیت بحیثیت انسان کے انتشار اور بگاڑ کا شکار ہو گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی قرآن مجید کے اس تصور عدل کی کامل و اکمل تصویر

ہے۔ بعض صحابہ کرام نے آپ کو دیکھ کر صیام وصال شروع کئے۔ بعض نے عبادت و ریاضت کے لیے خود کو وقف کر کے ازدواجی معاملات ترک کرنے کا ارادہ کیا۔ تو حضور سرکارِ دو عالم غضبناک ہو گئے اور فرمایا۔

ترجمہ: تم میں میرے جیسا کون ہے میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، میں عبادت بھی کرتا ہوں اور خانگی معاملات میں اپنے فرائض ادا کرتا ہوں اور فرمایا۔ فمن رغب عن سنتی فليس مني یعنی ترک دنیا اور معاملات زندگی سے راہ فرار کی اسلام قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ الارہبانية في الاسلام القرآن (۵۷-۲۷) اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ وہ تو دنیا کو آخرت کا ایک لازمی حصہ قرار دیتا ہے۔ ان دونوں میں اعتدال مقصود انسانیت ہے۔

عقل و حواس میں وحی کو معیار بنایا جو ترجمان عدل الہی ہے۔ عقل کو نہ تو غیر مشروط معیار حق و صداقت قرار دیا اور نہ اس کے استعمال پر تالے ڈالے ہیں بلکہ اس کی حدود متعین کر کے اس کے استعمال میں اعتدال پیدا کیا۔

الغرض انسان کی انفرادی زندگی کے فکری اور عملی پہلوؤں کو حد اعتدال میں رکھنا تعلیمات قرآنی کا ایک خاص مقصد ہے۔ تمام اخلاق فاضلہ، خصائل حمیدہ اور سعادت کے تصورات کا لازمی جزو اعتدال ہے۔

قرآن مجید میں عائلی معاملات میں خاوند اور بیوی کے درمیان حقوق و فرائض کی حد بندی کی جو ان کی فطرت کے عین مطابق ہے فرمایا۔ ومن مثل الذی علیہن۔ ترجمہ: وہ عورتوں کا حق بھی ایسا ہی ہے جیسا ان پر ہے۔ (۲۲۸-۲) خاوند کو حسن سلوک اور بیوی کو حسن معاشرت کی تعلیم دی۔ ایک سے زائد بیوی کی صورت میں ان کے مابین حقوق ازدواج کی ادائیگی عدل کرنے پر زور دیا۔ کہ ان خفتم الا تعدوا احدتہ۔ اگر ڈرو کہ دو بیویوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی کرو (۲۰۴)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں خود مثال قائم فرمائی اور اس شخص کے

بارے میں جو ازدواج میں عدل برقرار نہیں رکھتا۔ فرمایا کہ وہ قیامت کے روز اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا ایک پہلو جھکا ہوا ہوگا اپنی اولاد میں بھی امتیازی سلوک کو روا نہیں رکھا گیا۔ ایک صحابی بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے عرض کی میں اپنے فلاں بیٹے کو فلاں باغ وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا ایسا دوسروں (دوسرے بھائیوں) کے لیے بھی کر رہے ہو۔ عرض کی نہیں۔ فرمایا پھر تمہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں۔ ان میں برابر ہی قائم کرو۔ (مشکوٰۃ المصابیح) وصیت، لین دین اور معاہدات میں عدل اور حق و صداقت، معاملات کو صفائی کے ساتھ طے کرنے کی تلقین کی۔ ظلم و تعدی، بے انصافی اور حد اعتدال سے تجاوز کی ممت کی۔ تجارت۔ ناپ تول اور وثیقہ نویسی میں عدل اور درستگی کا پورا پورا لحاظ رکھنے کا حکم دیا۔ ۴۔ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (۵۵-۹) اور انصاف کے ساتھ تول قائم کرو اور وزن نہ گھٹاؤ۔ ولیکتب بینکم کاتب بالعدل ر ۲ - ۲۸۲ اور چاہئے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھے والا ٹھیک ٹھیک لکھے۔ ان معانی میں قرآن مجید کا نظریہ عدل معاشرہ کے معاملات اور معاہدات بین الافراد کی صحت و تکمیل کے لیے ناگزیر ہے۔

انسانی زندگی کا اہم پہلو جس میں عدل کے قیام اور نفاذ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ افراد کے باہمی حقوق و فرائض کے بارے میں تنازعات کو طے کرنے میں ہے۔ اس ساری کارروائیوں میں قاضی گواہ۔ فریقین مقدمہ اور ماہیت قانون خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ قانون جو عدل پر مبنی ہے۔ وہ ہی ہے جو مرضی کرب ہے۔ امت مسلمہ شہادت کی حیثیت سے اس کا ہر فرد عدل کا پابند ہے۔ حق و صداقت کا برطانو اظہار ایمان کا تقاضا ہے۔ کتمان شہادت مسلمان کی شان کے منافی ہے۔ ۵۔ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ (۲-۲۸۳) اور گواہی نہ چھپاؤ۔ حج یا قاضی اپنے فیصلہ میں عدل و انصاف کا ہر حال میں دامن تھامے رکھے۔ رشوت۔ لحاظ مروت۔ دوستی و دشمنی، عزت و منصب اور امتیاز۔ رنگ و نسل اور اختلاف زبان و تعصبات اور قربت درشتہ داری کے تعلقات راہ عدل سے ہرگز نہ بٹھا سکیں۔

۴۔ وَلَا تَدُلُّوا بِمَا إِلَى الْحُكَّامِ لِيَتَاكَلَفُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْأَثَمِ۔ (۲-۱۸۸)  
 ترجمہ۔ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لیے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھالو۔  
 لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَا نُ قَوْمٍ عَلَىٰ آلَا تَعْدِلُوا۔ اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵-۱۸) ترجمہ۔ تم  
 کو کسی قوم کی عداوت نہ ابھارے کہ انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو۔ وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔  
 اس ضمن میں پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین کی زندگی سے بے شمار مثالیں پائی جاسکتی  
 ہیں۔ فریقین مقدمہ کو صاف گواہ سے کام لینے کا حکم دیا۔ کیونکہ یہی تقاضائے عدل ہے۔

عقوبات بھی تانوں عدل کے تحت جرم کی نسبت سے نرم یا سخت ہیں۔ دنا جتنا  
 قبیح جرم ہے۔ اس کی سزا اتنی ہی بھیانک، چوری جتنا بُرا فعل ہے۔ سزا اتنی ہی برت ناک، قتل  
 جس قدر دردناک عمل ہے۔ سزا اسی قدر حوصلہ شکن۔ ۷۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوِّمِينَ  
 بِالْقِسْطِ شَهِدُوا لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا  
 فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ إِنْ تُعْدِلُوا۔ (۵-۳۸) ترجمہ۔ اے ایمان والو!  
 انصاف پر خوب قائم ہو جاؤ۔ اللہ کے لیے گواہی دے۔ چاہے اس میں تمہارا اپنا نقصان ہو۔ یا ماں باپ  
 یا رشتہ داروں کا۔ جس پر گواہی دو۔ وہ غنی ہو یا فقیر۔ بہر حال تو اللہ کو اس کا سب سے زیادہ اختیار  
 ہے تو خواہش کے پیچھے نہ جاؤ کہ حق سے الگ پڑو۔

جو عورت بدکار ہو اور جو مرد تو ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔ (۲۴-۲)

اور جو مرد یا عورت چور ہو۔ تو ان کا ہاتھ کاٹو۔ ان کے کٹے کا بدلہ اللہ کی طرف سے سزا۔

(۵-۳۸)

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید کا نظریہ عدل اتنا جامع اور وسیع مفہوم رکھتا ہے۔  
 کہ کائنات اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات اس کے اندر سمٹ آتے ہیں۔



# ہادی برحق اور تربیت نفس

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی ایک عظیم شخصیت ہی نہیں بلکہ شخصیت ساز بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تربیت سے حروفِ بجد سے ناواقف بزمِ علم و حکمت کے صد نشین اور قافلہ تہذیب تمدن کے سالار بنے۔ درسگاہِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے فارغ التحصیل، معارفِ تانی، اسرارِ فوقانی کے ماہر، اخلاقِ حسنہ کی مجسم تصویر فاتحِ عالم بن کر نکلے۔ احادیثِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سچائی، دیانت، سخاوت، ہمدی، صفائی، ایفائے عہد، عدل، عجز و انکسار، مستقل مزاجی، بردباری، مردِ مومن کی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں جھوٹ، بددیانتی، بخل، ظلم، بغضِ عہد، کبر و عجب، تذبذب، سستی، عداوت و دشمنی اور فضولِ خرچی جیسے اوصاف شخصیتِ مسلم کے منافی ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نفس کو بد اخلاقی اور نفعی اوصافِ شخصیت سے بچانے اور اسے نفسِ مطمئنہ کی سطح پر لانے کیلئے جو تربیتی نظام جاری فرمایا، اس کی بنیاد علم و حکمت، ایمان و ایقان اور عبادت و ریاضت پر ہے جن کا تعلق قلب و روح اور بدنِ تینوں سے ہے۔ اور یہی تین نفسِ انسانی میں اجزائے تکمیلی ہیں۔ علم و حکمت نیکی کے مترادف ہے۔ اور نیکی کی اصل ایمان باللہ اور خشیتِ الہی ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ایک ساعت کافروں کو تندرست سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ اور فرمایا کہ صاحبِ علم کی نسبت عابد کے ساتھ اتنی جتنی میری تم میں سے کسی ایک دنی پر ہے۔

خشیتِ الہی کو اصل علم قرار دیتے ہوئے فرمایا:

رَأْسُ الْحِكْمَةِ فَخَافَةَ اللّٰهَ ۝ (سب سے بڑی حکمت اللہ کا ڈر ہے۔)

گو یا علم نافع وہ ہے جو خشیتِ الہی پیدا کرتا ہے۔ اور اصحابِ علم وہ ہیں جو :-

كَلَّمْنَا اَزْدَادًا وَمِنْ هُدًى الْعِلْمِ اَزْدَادًا لِلّٰهِ تَوَاضَعًا وَخُشْيَةً وَاثِكِنَا رَاۤءَ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دعا کی تعلیم دیتے تھے۔

اللهم انى اعوذ بك من علم لا ينفع ومن قلب لا يخشع ومن نفس لا تشبع.

نیکی نظر تا انسان کے اندر موجود ہے خشیتِ الہی، تزکیہ نفس کا کام دیتی ہے۔ کیونکہ نیکی سے

دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ ایک صحابی نے جب عرض کیا کہ میں نیکی اور بدی میں کیونکر تمیز کر سکتا ہوں۔ تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

البر ما اطمئنت اليه نفسك والذنب ما حاك في صدرك او كما قال

رسول الله صلى الله عليه وسلم ۝

جہالت اور غفلت وہ آفت ہے جو آئینہ قلب کو کدھر کر دیتی ہے۔ اور نیکی اور بُرائی کی تمیز اٹھ جاتی

ہے۔ قلب افکار کا محل ہے۔ اور اپنی افکار سے ایمان کا صدر ہوتا ہے۔ اگر خشیتِ الہی دل میں موجود ہو تو افکار

باطل نہ اُس میں راہ پاسکتے ہیں۔ اور نہ ہی اعمالِ قبور کا صدر ہو سکتا ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :-

أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مَضْغَةً إِنْ صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِنْ فَسَدَتْ

فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ

دل صالح اور صاف خون پوسے بدن کو سپہیلی کرتا ہے تو سائے بدن کی صحت کا دار و مدار دل پر ہے

دل خراب ہو جانے تو جسم کے تمام اعضا میں گند خون پھیل جاتا ہے جس سے امراضِ جسمانی کا ظہور ہوتا ہے۔ یعنی

قلب اگر خوفِ الہی سے آشنا ہو تو انسان کے اعمالِ حسنات ہوتے ہیں۔ خوفِ خدا اٹھ جانے تو سیئات کا

دروازہ کھل جاتا ہے۔

انسانی شخصیت کی معراج معرفتِ الہی ہے۔ اور علم کا وظیفہ بھی یہی ہے کہ قلبِ انسانی پر معرفتِ الہی کی

شمع روشن ہو۔ انفس و افاق کی آیات کا مطالعہ یقین کی دولت سے مالا مال کرتا ہے حضور علیہ السلام نے انسان کے اندر کی دنیا کو عالم اکبر قرار دیا۔ معرفتِ نفس کو معرفتِ رب کے ساتھ ایک قریبی تعلق کی حیثیت سے فرمایا۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ ۝

شخصیت کی تکمیل پر رُوح و بدن اور دین و دنیا کے تقاضے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

ليس بخيركم من ترك دينه لآخرته ولا من اخرته لدينه.

دنیا و آخرت میں نیکی کی طلب شخصیتِ مسلم کا تقاضا ہے۔

مشکوٰۃ شریف کی ایک طویل روایت میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عبادت و ریاضت کو دیکھا تو اپنی عبادت کو بہت کم سمجھا۔ بعض نے طے کیا کہ وہ رات بھر نوافل میں گزاریں گے۔ دوسرے نے ہمیشہ روزہ رکھنے کا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو خفا ہوئے۔ اور فرمایا کہ میں عبادت بھی کرتا ہوں۔ روزے بھی رکھتا ہوں۔ شادی و بیاہ کی رسوم بھی ادا کرتا ہوں اور فرمایا کہ:-

التَّكَاثُرُ مِنْ سُنَّتِي فَنَنْ سَنِبُ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي.

دین و دنیا میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ جھکاؤ شخصیت میں بگاڑ کا موجب بنتا ہے۔ عبادات و معاملات حقوق اللہ اور حقوق العباد مل کر ایک وحدت بنتے ہیں۔ اور یہی مسلمان شخصیت کی تعمیر کا اصل اصول ہے۔ ایمان باللہ اور عبادت جہاں روح کو پاکیزگی اور بالیدگی عطا کرتے ہیں، وہاں شخصیت کی کمی اور خوبیاں بھی اُجاگر ہوتی ہیں۔ پھلا وہ شخص کیسے حریم ہو سکتا ہے جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے۔ کبر و فخر اور عجب کی کہاں گنجائش رہتی ہے، جو اپنی پیشانی بارگاہِ ایزدی میں خم کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نقصان کا خوف اور نفع کی امید میں انسان بسا اوقات راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ لیکن وہ جاوہر منزل حیات پر بلا خوف و خطر گامزن ہوتا ہے۔ جیسے سید عالم کا یہ ارشاد ہے۔

ولو جهد العباد ان ينفكوا بشئ لم يقض لك لم يقدر و اعليه

ولو جهد العباد ان ينفروا بشئ بل يعرضه عليك لم يقدروا۔

دوسرا تذبذب اور اگر مگر کی پالیسی سے انسانی شخصیت قوت فیصلہ سے محروم ہو جاتی ہے حضور  
علیہ الصلوٰۃ والسلام ایسے مرحلہ پر اپنے رب سے استقامت اور توکل کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا۔

احرص على ما ينفعك واستعن بالله ولا تعجز وان اصابك شئ فلا تقل

لو اني فعلت كان كذا لكدنا۔ قل قدر الله ما شاء الله۔ فان "لو" تفتح

عمل الشيطان۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ "کاش" کا کلمہ احساس محرومی بے ہمتی اور کم توجہ کی دلیل ہے۔

بلاشبہ الفاظ کا استعمال شخصیت کے جانچنے کا اعلیٰ معیار ہے۔ اور مخصوص جملوں کا استعمال قوت ارادی میں

بے پناہ اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "نؤہ کے بارے فرمایا کہ یہ عمل شیطان کا

وردانہ کھول دیتا ہے۔ اور وہ مایوسی و محرومی ہے۔ مایوسی شیطان کا فعل ہے۔

مومن کا رحمت خداوندی پر پورا یقین ہے مشکلات و مصائب میں وہ نہیں گھبراتا۔ اس لئے کہ رحمت خداوندی

کا ہر حال امیدوار ہوتا ہے۔ مصائب و آلام بھی بالآخر اس کے حق میں خیر ثابت ہوتے ہیں۔ ابتلا و آزمائش

میں مہر کی لذت اور آرام و آسائش میں شکرانہ نعمت سے شخصیت میں استحکام اور استواری آتی ہے۔ ہر نصیب

ہر وقت گویا اللہ تعالیٰ کی تحلی ہو رہی ہے۔ اور جذبہ محبت الہی سے بیماریوں، بلاؤں اور فاقوں پر بھی اسرار

لطف و رحمت کا نظارہ کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اذا احب الله عبدا ابتلاه فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاه

مغز اب ہم سے ساری محبت چھیرا جاتا ہے۔ اور انعام و اکرام سے محبت کا امتحان لیا جاتا ہے۔ رسول

لام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔

حضرت فہمنۃ بالمکان و حفت النار بالشہوات

نعمت کثرت سے انسان کو اخلاقی اور روحانی برائیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر احساس کم

ہو تو نعمت کی قدر و قیمت باقی بھی رہتی ہے۔ اور انسان اس کے غلام استعمال سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔

من نزلت الیہ نعمة فلیشکرھا

اور فرمایا کہ۔

النعمة وحشية قید وھا بالشکر

معتقدات کے علاوہ کچھ ایسے میلانات، خواہشات اور عواطف بھی ہیں جو انسانی جبلت کا تقاضہ ہیں۔ یہ جبلتی قوتیں جنہیں منہ زور شہوانی گھوٹے کہا جاتا ہے۔ انسان کو اپنی مرضی سے چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پختہ یقین اور کامل ایمان نہ ہو تو یہ خواہشات انسان پر غالب آجاتی ہیں۔ اور انسان بند خواہشات ہو کے رہ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا یؤمن احدکم حتی یكون هوٰا تبعًا لما جئت به

گو یا عقل میں روشنی اُس وقت آتی ہے جب وہ حرص و آرزو سے آزاد ہو کر علم وحی کے تابع ہو جاتی ہے۔ محبت الہی اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فراوانی ہی انسان کی قوت غضبیہ، قوت بہیمیہ اور قوت عقلیہ کے درمیان اعتدال رکھ سکتی ہے۔

یوں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تربیت نفس کے طرق اور تعمیر شخصیت کے بنیادی اصول و ضوابط کا ایک کامل اور مکمل نظام عطا فرمایا، جو دین و دنیا میں بھلائی کی ضمانت دیتا۔ نہ صرف جیسا طیبہ سے، بلکہ اپنے غلاموں کے تزکیہ نفس اور معاشرتی زندگی میں اُن کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی کو متعین کرنے کا عمل ثبوت دیا۔ اللہ کریم ہمیں اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین تم آمین۔

# تصورِ حکمت

## مفہوم و مطالب

قرآن مجید کا عظیم اعجاز اس کا اسلوب بیان ہے۔ عرب کا وہ معاشرہ جن میں فصیح الفصحاء اور اشعر الشعراء موجود تھے جنہوں نے اپنی فصاحت و بلاغت اور حسن بیان و کلام کی بنیاد پر پوری دنیا کو عجم گونگا کر رکھا اور یہ قرآن مجید نے اپنی معجز بیانی اور کلام ربانی ہونے پر انہیں کھلا چیلنج کرتے ہوئے فرمایا۔

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ (تم اس کی مثل ایک سورت ہی بنا کر لاؤ۔)

کلام خداوندی کے سامنے ان کے عجز اور در ماندگی کو کھول کر بیان کیا کہ۔

اے لوگو! تم ایسا ہرگز نہیں کر سکو گے خواہ تم اپنے پہلے اور اگلوں کو جمع کر لو تاکہ برہان

قرآنی کے مقابلہ میں کوئی دلیل لا سکو۔ جب ایسا ممکن نہیں ہوتا تو قاضائے دانش و حکمت ہی

ہے کہ ”تم اس آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن پتھر اور لوگ ہوں گے“۔

قرآن مجید کا ایک ایک کلمہ معانی و محاسن کا بحر ناپید کنار ہے۔ جس قدر معنوی گہرائی میں چلے جائیں، مسلم و حکمت اور دانش و عیش کے انمول جواہر تک سائی برہمتی ہی جاتی ہے۔ ایک سے ایک یگانہ اور حسن و خوبی میں در پیمثال۔

آئیے! قرآن مجید میں وارد کلمہ ”حِکْمَةٌ“ کی لغوی اور معنوی تکمیل و تجزیہ کے بعد اس کی وسعت و جامعیت، گہرائی و گہرائی کا جائزہ لیں۔

لفظ عرب میں حکمت ”الْمَنْعَةُ لِلْإِضْلَاحِ“ سے عبارت ہے۔ اپنے نفس کو ہر اس چیز سے روکنا۔

جو مفہور ثابت ہو سکے۔ "اِحکام" لغوی اعتبار سے لفظ حکمت کے قریب ہے۔ اہل عرب جب گھوڑے کو لگام ڈالتے تو اسے "اِحکام" سے تعبیر کرتے تھے۔ حکمت کے ساتھ اس کی مناسبت یہ ہے کہ جیسے "حکمتہ" میں نفس کو خواہشات اور مفہورات سے باز رکھنے اور قابو میں لانے کے معنی ہیں۔ وہاں "اِحکام" لغوی اعتبار سے گھوڑے کو سرکشی سے باز رکھنے اور روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ مشرکین مکہ کی ہجو میں کہتے ہیں۔

وَنَحْمُ بِالْقَوَانِي مِنْ هَجَانَا وَنَضْرِبُ حِينَ تَخْتَلَطُ الدَّمَاءُ

ایک شاعر دشمن قبیلہ کی مذمت کرتے ہوئے یوں کہتا ہے۔

أَبْنَى حَنِيفَةَ أَحْكَمُوا سَفَهَاءَ كَمْ

اِحکَم اس مفہوم کے اعتبار سے 'مضبوطی' اور 'قطعیت' کے معنی کو شامل ہے۔ "ایاتِ حُكْمَاتٍ" سے مراد وہ آیات ہیں، جو صریح المعنی اور فی المراد ہیں۔ یوں 'حکمتہ' اور 'احکام' دونوں ایسے معنی پر دلالت کرتے ہیں جو شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ 'عُكْم' جو ORDER کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اپنی قطعیت، غیر متبدل اور واجب العمل ہونے کے اعتبار سے "حکمت" کے مرادف ہے۔ "حکَم" کا فیصلہ فریقین مقدمہ کے لئے قطعی ہوتا ہے۔ یوں "حکَم" فیصلہ کرنے والے کے مفہوم میں "حکمت" کو متضمن ہے۔ عمومی لحاظ سے یہ جملہ مرادفات حکمت میں علم کے معنی لازمی پلتے جلتے ہیں۔

اس لغوی اور معنوی تحلیل سے ان جملہ کلمات میں قدر مشترک قطعی ہونا ہے۔ جو غایۃ علم اور یقین کا پتہ دینے کے ساتھ مفہورات سے بچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ کلمہ کئی آیات میں وارد ہوا ہے۔ مثلاً:-

وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ.

وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.

لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلو  
 عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة و  
 يوقى المحكمة من يشاء ومن يوت الحكمة فقد اوتي خيرا كثيرا  
 واتينا القمان الحكمة ان اشكرلى .  
 لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم .  
 ان الحكم الا لله .

آيات محكمات هن ام الكتب .  
 ..... فابعتوا حكما من اهلله .

اد ۶ الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة .

حکمت کی لغوی بحش کے سیاق میں قرآن مجید کی ان آیات سے بنیادی طور پر جس حکمت کی طرف  
 اشارہ ملتا ہے وہ خالق ہے انبیاء کا عقل انسانی کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ یہ علم و عرفان کی وہ اعلیٰ قسم  
 ہے، جو اذکات بشری سے ماوراء ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے صفات قلب اور صفات  
 قدسیہ کی بنا پر انہیں اس فیضان علم و عرفان کے لئے منتخب فرماتا ہے۔ عقل و ادراک اور حواس کی بجائے  
 بالذاتی انداز سے عرفان کی یہ نوع ان مقدس اور برگزیدہ بندوں کے سینوں میں منتقل ہوتی ہے۔ یہ خزینہ  
 حکمت جو وحی متلو یعنی قرآن اور غیر متلو یعنی سنت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے۔ ظاہر و  
 باطن، معاشی و معاد، روح و مادہ، اصلاح فرد اور فلاح معاشرہ کی قطعی حتمی اور ناقابل تردید ضمانت دیتا  
 ہے۔ حکمت اس حکیم کی جانب سے ہے جو خالق کائنات ہے۔ جس کی قلمرو میں بحر و بر اور عرش و  
 فرش کی تمام زردستیں، حکومت و حاکمیت جیسے مسلم ہے، اور جس کا ہر فعل حکمت و دانش پر مبنی ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "الکتاب" سے مراد قرآن مجید اور "الحکمة" سے  
 مراد "ذات صفتی علیہ التمجید والنشأ" ہے۔

حکمت کی دو ہی قسم، جس پر قرآن مجید کی متعدد آیات دلالت کرتی ہیں۔ اور اس میں عقل انسانی کا

87502



ہے، دونوں میں منقسم ہے۔ (۱) حکمتِ نظری اور (۲) حکمتِ عملی۔

ابن عربی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

”معنی حکمت بجز علم کچھ نہیں۔ اور معنی علم سوائے عقل کچھ نہیں۔ البتہ حکمت میں علم کے معنی کے علاوہ نتائج اور ثمرات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ علم کا ثمر ہے اس کے مطابق عمل کرنا، تصرفات میں اسے حکم بنانا اور تمام اقوال و افعال میں اس کے مطابق چلنا۔“

لغوی اعتبار سے عقل کے معنی نیکیل ڈالنے کے ہیں جس سے اونٹ کو قابو کیا جاسکتا ہے۔ ”احکام“ اور ”عقل“ لغوی اعتبار سے صرف اس قدر مختلف ہیں کہ اول الذکر گھوڑے کو کنٹرول کرنے کے لئے ہے۔ اور مؤخر الذکر اونٹ کو، لیکن بایں ہمہ دونوں سے مراد نفسِ انسانی ہے، جسے خواہشات کے منہ زور گھوڑے اور اونٹ کا سا کینہ اور غیظ و غضب، خطرات اور مضرت میں دھکیل دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ”حکمت“ اور ”عقل“ وہ قوتیں عطا فرمائی ہیں، جو اسے نفس کی سرکشی اور خواہشات کی پیروی سے باز رکھتی ہیں۔ کامل ایمان کی علامت بھی یہی ہے، کہ سفلی جنوبات اور مہمے نفس کو قابو میں رکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا یومن احدکم حتی یكون هو اذ تبع ما جئت به۔

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی خواہشات کو میرے دین کے تابع نہ کرے۔

اس سے اسلام میں حکمت اور عقل کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ دوسرا ”حکمت“ اور ”عقل“ دونوں علم کی بنیاد پر استوار ہیں۔ فکر و نظر جو حکمت کی حقیقت اور ذات ہیں۔ قرآن مجید کا خاص موضوع ہیں۔ سینکڑوں آیات ”آفاق و انفس“ میں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

گردشِ لیل و نہار، شمس و قمر اور کواکبِ انجم سے سبھی مخلوقِ سما، زمین اور اس کی سرسبز و شاداب وادیاں، کوہسار کی بلندیاں اور سمندر کی پہنائیاں، سمندر کی ٹھانٹھیں مارتی موجیں اور گنگناتی ندیاں، باغات میں مسکراتی کلیاں اور چٹنے۔ غنچے، طائرانِ صبح کا ہی اور مرغابِ خوش نوا، یہ سب عظیم حسد کی

طرف دعوت دیتی ہیں۔

جب انسان صغیر ہستی اور گلشن گیتی کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے۔ قدرتِ خداوندی اور اس کی حکمتِ کاملہ کا مشاہدہ کرتا ہے، تو نگاہیں ایمان و ایقان کی دولت سے بھر جاتی ہیں۔ دل کی کائناتِ خدائے ذوالجلال کے ذکر سے معمور ہو جاتی ہے۔ اور انسان جب خود میں ڈوب کر خود کو تلاش کرنے نکلتا ہے تو "حکمت" اسے عرفانِ نفس کی راہ دکھاتی ہے۔ یہ وہ عظیم وظیفہ ہے، جس کے بارگاہیاب۔

من عرف نفسه فقد عرف ربه

یہ ہے حکمتِ نظری جو خود شناسی اور خدا شناسی میں انسان کی راہبری کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ قرآن مجید کی انہی تعلیمات نے مسلمانوں کو تحقیق و جستجو کی راہ ہموار کی۔ انکشاف و انکشاف اور کائنات کے سر بستہ دنیوں اور غریبوں کو ظاہر کرنے کا جو صلہ اور جرات بخشی۔ اور اسی فکر نے سائنسی علوم کے راہ کھائی۔

غرضیکہ حکمتِ نظری کائنات کے اندر غور و فکر کرنے اور حقائقِ اشیاء تک رسائی کے لئے ایک فکری قوت سے عبارت ہے جو علم و ایمان کی خواہیدہ صلاحیتوں کو عمل میں لا کر خود آگاہ بھی بناتی ہے اور خدا آگاہ بھی۔

اس کے ساتھ یہ مت بھولنے کہ قرآن مجید حکمتِ نظری کے ساتھ حکمتِ عملیہ کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتا ہے۔ محض فکر و نظر کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن مجید عمل کو بھی اتنا ہی اہم قرار دیتا ہے۔ حکمت کی ہر دو نوع ایک دوسرے سے مل کر ایک کل بناتی ہیں۔ ایمان و ایمان حکمتِ نظری سے مل کر اخلاق کی تکمیل کرتے ہیں۔ یوں حکمتِ عملی نتیجہ ہے حکمتِ نظری کا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس الحکمة عنفاة اللہ۔ (سب بڑی دانائی خدا کا خوف ہے)۔ کیونکہ اصلاحِ احوال اور تزکیہ نفس کی بنیاد خوفِ خدا ہے۔

حکمتِ عملی وہ استعداد ہے جس کے ذریعے انسان اخلاقِ فاضلہ سے مزین اور رزائل سے پاک ہوتا ہے۔ اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہونا اور رذائل سے پاک ہونا، نفسِ انسانی کی تکمیل کا موثر ترین

ذریعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت کا اظہار فرمایا۔

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق .

بے شک میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔

حکمت عملی کا یہ پہلو انسان کی اپنی ذات سے ہے۔ اس کی ایک دوسری نوع جس کی ہدایت قرآن مجید نے فرمائی۔ وہ حکمت دعوت و ارشاد ہے۔ اس کا تعلق اجتماع اور معاشرہ کے ساتھ ہے۔

حکمت دعوت وہ اسلوب بیان و کلام ہے جو اپنی صداقت اور حقانیت کے اعتبار سے حکمت الہیہ سے مستفید ہے اور مقضائے حال کے مطابق، دعوت کے اصولوں میں سے ہے۔ کلموا الناس علی قدر عقولہم۔ (لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کرو۔)

حضور ختمی المرتبت سالتاب صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العزت نے جو امع الکلم عطا فرمائے۔ اور اپنی امت اور انسانیت کے لئے کمال رحمت و شفقت مرحمت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ میں دعوت اسلام کا منہج اور ارشاد و تلقین کی اعلیٰ مثالیں موجود ہیں۔ ادیار کرام اور صوفیائے عظام نے اس حکمت عملی کو خضر راہ بنایا، تو لاکھوں ضلالت و گمراہی میں بھٹکنے والوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کیا۔ قرآن مجید کی حکیمانہ تعلیمات پر مبنی ”حکمت“ وہ اصل الاصول ہے جو فکر و نظر، علم و عمل ظاہر و باطن اور دین و دنیا کی تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔

ربنا اتنا فی الدینا حسنة و فی الاخرۃ حسنة و قنا

عذاب النار۔

# نظام مصطفیٰ

## چند بنیادی اصطلاحیں

اسلام مصدبہ اسلم کی خبر کے معنی میں خضع و استسلم جیسے کہا جاتا ہے، اسلمت الشی الی فلان یعنی ادیتا لیه ودخل فی السلم۔ اس دین حق کا نام "اسلام" رکھنے میں بھی مناسبت ملحوظ ہے۔ یوں اسلام کے معنی ہوتے، اللہ کے حضور کامل سپردگی کا مظاہرہ اور تمام تر امور اسی کو تفویض کر دینا۔ اس طرح اللہ جل شانہ کے سامنے عاجز و ذلیل اور انکساری ہی کا نام ہے۔ اور حقیقت اسلام دین کو اللہ کے لئے خاص کرنے اور اسی کو معبود سمجھنے سے عبارت ہے۔ مفہوم اس کا ظاہر و باطن ہر گناہ سے شکر کی لالتشوں سے دل کو پاک صحاف کرنا، اور نفس کو ریا کاری اور لوگوں کی چاہلوسی سے آزاد کر دینا ہے۔ یہ وہ نفسیاتی کیفیت ہے، جو نفس کو ہر قسم کے خوف سے آزاد کر دیتی ہے۔ اور یوں انسان ہر قسم کے شکر پر غالب آجاتا ہے۔ تمام لوگ برابر کی حریت انسانی کے مالک بن جاتے ہیں۔ اس طرح ۶ بیت اور مساوات اسلام کو قبول کرنے کا نتیجہ ہیں۔

اسلام مجموعہ ہے ان اصول و قواعد کا جنہیں قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کیا۔ اور جن کا مقصد معاشرہ کی اجتماعی تنظیم ہے۔ یہ وہ مبادی اور اصول ہیں، جن پر واقعی عہد مصدبہ اسلام میں ٹھیک ٹھیک عمل ہوا۔ خلفاء راشدین نے عمان حکومت بنی حلیٰ تو زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق فلاح و بہبود کیلئے تعلیمات مصطفویہ کے ساتھ آپس میں بی بی وراصل نظام مصطفیٰ علیہ سببہ والثناء کی تمام تر تفصیلات کا سرچشمہ میں۔ تا قیامت آنے والی سلور

کے لئے نظام حیات ہے۔ اس میں حالات کی ترقی کے ساتھ ساتھ چلنے اور بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کی انتہائی گنجائش موجود ہے۔ اور یوں یہ حکومت کے مبادی اور تنظیم کو مفصل طور پر اپنے اندر مولیتا ہے۔

اس لئے کتاب و سنت نے اسلامی ریاست کے مبادی کی تخصیص کی۔ دیگر فرسوخ اور تفصیلاً علماء کے اجتہاد پر چھوڑ دیں کہ وہ ہر زمانے کے حالات کے پیش نظر اس کی تطبیق کر سکیں۔ تاکہ ایک لوگوں کو غیر معمولی مشقت نہ اٹھانا پڑے اور دوسرے قواعد محض مجبوراً شکار نہ ہو جائیں۔ اسی طرح مسلمان تہذیب تمدن کے قافلہ کا ہر زمانہ اور ہر جگہ ساتھ دے سکیں۔

وہ مبادی اور کلیات جو ہمارے لئے راہنما خطوط متعین کرتے ہیں، وہ یہ ہیں۔

(۱) بنیاد عدل۔ (۲) بنیاد مساوات۔ (۳) بنیاد شوری۔

### بنیاد عدل

بنیاد عدل وہ راہنما اصول ہے، جس کی ہر حکومت اسلامیہ اپنے معاشرہ میں نفاذ کا اہتمام کرتی ہے۔ اس میں کسی گروہ کی تخصیص نہیں، اور نہ کسی شخص کی تمیز۔ بلکہ اس میں مسلم اور غیر مسلم، مرد اور عورت، سیاہ و سفید، دوست اور دشمن سب برابر ہیں۔

وإذا حکمتم بین الناس ان تحکوا بالعدل ولا یج منکم

شأن قوم علی الا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوی۔

(القرآن)

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے۔ رہا مسئلہ عدالتی نظام کے قیام، تنظیم قضاة، قاضی اور اس کے درجات اور اختیارات وغیرہ، تو ایسے مسائل اس کے لئے حکومت وقت ہر شہر کے لوگوں کی رسوم و رواج اور ضروریات مصالح کے پیش نظر طے کر سکتی ہے۔

### بنیاد مساوات

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں اس کی اصل بلا تیز رنگ نسل اور دین و عقیدہ کے نفس

انسانی مساوات پر ہے۔

يا ايها الناس انا خلقناكم من ذكر وانثى وجعلناكم شعوبا وقبائل

لتعارفوا ان اكرمكم عند الله اتقاكم۔ (القرآن)

يا ايها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم من نفس واحدة وخلق

منها زوجها وبت منها رجالا كثيرا ونساء واتقوا الله الذي

تساءلون به والارحام ان الله كان عليكم رقيبا۔ (القرآن)

### شورائیت

شوری کو قرآن مجید نے ایک قانون کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ اور مومنین کی یوں تعریف کی

وامرهم شورى بينهم۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا۔

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب

لانفضوا من حولك فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم

في الامر فاذا عزمتم فتوكل على الله۔ (القرآن)

رہا اس شورائی نظام کی ہیئت کا مسئلہ، تو قرآن مجید نے یہ معاملہ حکومتِ وقت کو سونپ دیا،

کہ وہ ہر علاقے میں لوگوں کے مناسب حال اس کا ڈھانچہ تیار کریں۔

یہ شورائیت کبھی بالواسطہ جمہوریت سے ہو سکتی ہے۔ یا پھر قومی نمائندوں کے ذریعے۔ مزید ان نمائندوں

کے انتخاب کے معاملہ میں آیا بلاواسطہ انتخاب ہو یا نمائندوں میں مخصوص اخلاقی اور علمی صفاتِ اہلیت

ہو۔ یہ اور اس نوعیت کی ساری تفصیلات اولی الامر اور امت کے سپرد ہیں کہ وہ اپنی اجتماعی بہبود

کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیں۔ جہاں تک ”اولی الامر“ کا تعلق ہے، قرآن مجید نے ان کے بارے

میں اشارہ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اصحابِ رائے ہیں۔ اور ائمہ فکر ہیں۔ لوگ اپنے دینی اور تنظیمی معاملات

میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور اس ضمن میں یہی مرجعِ خلاق ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان

کی اطاعت کو واجب قرار دیا۔

يا ايها الذين امنوا اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم  
فان تنازعتم في شئ فردوه الى الله والرسول ان كنتم تؤمنون بالله  
واليوم الآخر وذلك خير واحسن تاويلا ۵ واذ اجارهم امر من  
الامن او الخوف اذا عوا به ووردوا الى الرسول والى اولى الامر  
منهم لعلهم الذين يستنبطونه منهم۔ (القران)

ازاں بعد اس مجلس شوری کی حد و شرط کا معاملہ ائمہ اور فقہاء پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنی حکومت کے  
وسائل کے مطابق اس کی ترتیب و تشکیل کا کام سرانجام دیں۔

اسی طرح احکام معاملات کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے ”مصلحت“ اور ”ضرر“  
کی ممکنہ اور معقول وجہ کی رعایت کی۔ اور یہ عرف و رواج اور اختلاف زمان و مکان اور لوگوں کے  
حالات کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل و تغیر کو قبول کرتی ہیں۔ اس لئے نظام مصطفوی میں ایک قاعدہ کلیہ  
پر اکتفا کیا گیا۔ اور دیگر تفصیلات مثلاً ”شرائط معاہدہ“ طمانیت اور یوں بہتر سے بہتر کی تلاش وغیرہ  
کے معاملات کو خود طے کرنے کی اجازت دی بشرطیکہ وہ نصوص قرآنیہ کی حد کے اندر ہوں۔  
ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يا ايها الذين امنوا اوفوا بالعقود۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غز، غنیم، احتکار جن سے مقصود مصنوعی گرانی پیدا کرنا  
ہے۔ اور اسی میں مصاح عامر کی رعایت کا پاس نہیں رکھا جاتا ہے، سے منع فرمایا۔

لا يبيع احدكم على بيع اخيه۔ (الحديث)

من احتكر اربعين يوماً برئت منه ذممة الله ورسوله۔ (الحديث)

علاوہ ازیں دیگر شروط معاملات اور طرق عقود و معاملات میں بنیادی شرط یہ ہے کہ حلال کو  
کو حرام اور حرام کو حلال نہ سمجھا جائے۔

یہ مثالیں ان امور سے متعلق ہیں، جو دین اسلام میں کلیات کی حیثیت سے ہیں تفصیلات  
اولی الامر کے اختیار اور اصحاب رائے پر چھوڑ دی گئیں کہ وہ مصاحح اور عرف اور ظروف کے مطابق  
طے کریں۔

ایک یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیوی زندگی اور امور دنیوی کے سلسلہ میں مقصود  
احکام و شرائع زندگی اور اس کے معاملات کی تنظیم ہے۔ راہ عبادت و عقاید کا معاملہ تو وہ اس  
سیاق سے خارج ہے۔ کیونکہ عقل اس کی مصلحت کا صحیح ادراک نہیں کر سکتی۔ وہ امور غیر متغیر اور غیر متبدل  
ہیں۔ اختلاف زمان و مکان سے ان میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہیں۔ اس لئے ان امور میں نصوں قطعیہ  
وارد ہیں۔ اور ان کے احکام مفصل اور واضح ہیں، جن میں کسی قسم کا ابہام اور غموض نہیں۔ نماز اور اس  
کے ارکان، سنن و واجبات، اوقات صلوٰۃ اور تعداد رکعات وغیرہ جیسے مسائل۔ ان میں کمی و بیشی نہیں  
قرآن مجید نے زکوٰۃ کی فرضیت کو بیان کیا۔ سنت نے اس کی حد و مقرر کیں۔ ان میں بھی اب کسی قسم  
کی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ یوں ہی نظام وراثت کی مثال ہے۔ ایسے ہی فرائض، شرعی عبادات، مثلاً  
روزہ، حج زکوٰۃ وغیرہ ہیں۔

اسی طرح وہ بنیادی اصول جن میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہو سکتا، وہ ہیں عدل کا جوہر  
شوری، رعایت حقوق، دفع ضرر، امانتوں کا ان کے اصل تک پہنچانا، اہم امور اصحاب علم و فضل کو سپرد  
کرنا، اور دیگر وہ عمومی امور جن پر اصلاح اُمت کا انحصار ہے۔

رہی احکام کی تفصیل اور جزئیات تو بنیادی مصادر شریعیہ، یعنی قرآن و سنت، سورہ اس  
کے درپے نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ سب کچھ فقہاء و علماء پر ہے۔ کہ وہ ہر زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضا  
کے مطابق قیاس و اجتہاد کے ذریعے ایسے قوانین کا استنباط کریں جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ان امور  
میں تشفی کا سامان مہیا ہو جائے۔ بلکہ یہ بھی ہو کہ ان کی معاشی زندگی میں کسی قسم کا تعطل یا خلل پیدا نہ ہو۔  
اس لئے ہے کہ شریعت اسلامیہ وہ اسخری پیغام ربانی ہے، جسے قیامت تک کے لئے باقی رہنا ہے۔  
جس پر کسی قسم کا نسخ طری نہیں ہو سکتا۔ اس لئے فروعی مسائل میں قیاس، استحسان اور مصاحح



مرسلہ سے فقہاء قانون سازی کر سکتے ہیں۔

امام عزالی فرماتے ہیں، شریعت کے مقاصد میں پانچ چیزیں داخل ہیں۔ دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، عقل اور نسل کی۔

جو ان پانچ امور میں داخل ہے، وہ مصلحت ہے۔ اور جو اس بنیاد سے ہٹ جائے وہ مفسدہ ہے۔ اور اسی کا دفع کرنا مصلحت ہے۔

علامہ شاطبی کہتے ہیں۔

”شائع لوگوں کی بہتری کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ ایک شے دیکھتا ہے جس میں

مصلحت نہیں۔ پس اگر اس میں مصلحت ہو تو جائز ہے۔

علامہ آمدی فرماتے ہیں۔

”احکام لوگوں کی بہتری کے لئے ہیں۔ کیونکہ اس امر پر اجماع ہے کہ احکام باری

کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتے۔ اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ ان کی منفعت اللہ تعالیٰ

کے لئے نہیں بلکہ انسانوں کے لئے ہے۔ اللہ کریم نے اپنے رسولؐ کے بارے فرمایا: وَمَا

اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ اور فرمایا ”رحمتی وسعت کل شیء“۔ اگر احکام

حکمت اور بہتری سے خالی ہو جائیں، تو رحمت کہاں رہے گی۔ پھر تو وہ رحمت بن جائیں

گے۔ لا ضرر ولا ضرار“ کلیہ ہے اور اگر بندے کو بغیر کسی مصلحت کے مکلف کیا جائے، تو وہ

اس کے لئے ضرر محض بن کر رہ جائے۔ لہذا لوگوں کی حاجات اور بہتری کی خاطر آئین میں

مصالح مرسلہ کو بھی ماخذ قانون کا مقام دیا گیا۔ اس پر صحابہؓ اور تابعین نے عمل کیا۔

علامہ شاطبی نے کئی مثالوں سے اسے واضح کیا۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا رجبہ رکھنے کا انتظام بنظم

حکومت کے لئے مختلف شعبوں کا قیام، عاملین کا مقرر کرنا اور صحابہ کبار کو آئین اور شوری میں شریک

کرنا وغیرہ۔

# نظامِ مُصطفیٰ ﷺ

## معاشرتی نظام

اسلام دین و دنیا اور جسم و روح کے تضاد کا قائل نہیں بلکہ انسانیت کی تکمیل میں دونوں کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۗ اللَّهُ يُحِبُّ  
 الَّذِينَ يُعْطُوا زَكَاةً وَأَمْوَالَهُمْ تُزَكَّىٰ وَهُمْ لَا يُرْمَوْنَ ۗ  
 اور رسول اللہ علیہ التَّحِيَّاتِ وَالسَّلَامِ نے فرمایا۔

ليس بخيركم من ترك ديناه لأخترته ولا آخرته لديناه.  
 تم میں نہ وہ بہتر ہے جس نے اپنی دنیا آخرت کے لئے چھوڑ دی اور نہ وہ جس نے دنیا  
 کے لئے اپنی آخرت برباد کر دی۔

اسلامی زاویہ نگاہ سے جیسے مادی لذتوں میں غرق ہونا سراسر ضلالت و گمراہی، ایسے ہی رہبانیت  
 اختیار کرنا، اور معاشرہ سے الگ تھلگ رہنا بھی قابل مذمت ہے۔ افراط و تفریط کی ان دو راہوں میں  
 اسلام نے اعتدال کی راہ دکھائی اور یوں دُعا تعلیم فرمائی۔

ربنا اتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة

ہے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی نیکی عطا فرما اور آخرت میں بھی۔

دین و دنیا کی بھلائی، معاش و معاد کی بہتری، مادہ و روح کی وحدت اور مسجد و ایوانِ حکومت

کی ہم آہنگی اسلامی نظام حیات کا طرہ امتیاز ہے۔

اسلام ایک کل ہے، جو عائلی قوانین، مخصوص نظام اخلاق و معاشرت، ضابطہ، سیاست اور نظم معیشت پر مشتمل ہے۔ یہ وہ سرچشمہ ہے جس سے ہماری کشت حیات کارگ و ریشہ سیراب ہو سکتا ہے۔ یہ وہ آفتاب ہدایت ہے جس سے ہماری قومی زندگی کا ہر گوشہ درخندہ و تابندہ ہو سکتا ہے۔ یہ کسی اعتبار سے تشنہ نہیں کہ اس کی تکمیل کے لئے کسی خزانہ ساز شریعت سے کوئی نظام مستعار لیا جائے۔

اسلام کا معاشی نظام بھی اسی نظر یہ حیات کا جزو لاینفک ہے۔ جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و مالکیت اور خالقیت ہے۔ انہیں تصوراتِ ثلاثہ پر اسلامی نظم معیشت کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔

ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اللہ ہی ہے، جس نے ہمیں اور ہم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ اس نے زمین کو فرش اور اس کی ہری بھری کھیتوں کو فردوسِ نگاه بنایا۔ گنبد نیل فام سے آپ حیات اتارا۔ زمین نے خزانے اگل دیئے اور انسانوں کے لئے نعمتائے گوناگوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ سارے جہاں اور ساری کائنات کو اسی ذات واحد نے پیدا کیا۔ یہ سب کچھ جو زمین پر چل پھل اور فضا میں بسیط میں پھیلی ہوئی کئی نیلیں اسی کی خالقیت و ربوبیت، قدرتِ غالبہ حکمتِ کاملہ اور اس کی حسین صنائی کا پتہ دیتی ہیں۔

انسان کی اپنی ذاتی کوئی شے نہیں۔ یہ سب خدا تعالیٰ کا ہے۔ وہ نہ چاہے تو انسان کچھ بھی نہیں پا سکتا۔ وہی خالق ہے۔ اور وہی رازق۔ یہ سب کچھ اسی کی ملکیت ہے۔ جو کچھ ہمارے ہاں ہے یہ اسی کی دین ہے۔

در حقیقت مالک ہر شے خدا است

ایں امانت چند روزہ نر و ماست

وجعلنا لکم فیہا معاش و من لستم لہ برار قین۔ (الحجر، ۲۰)

اور تمہارے لئے اس میں روزیاں کر دیں۔ اور وہ کر دیئے جنہیں تم رزق نہیں دیتے۔

و ما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقہا۔ (ہود، ۶)

اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔

و کابین من دابة لا تحمل رزقہا اللہ یرزقہا و ایاکم۔

کوئی زمین پر چلنے والا اپنا رزق خود نہیں پاتا۔ اللہ انہیں اور تمہیں رزق دیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ ذہنیت کفرانِ نعمت باری سے پیدا ہوتی ہے۔ مال و دولت کی ریل پیل سے انسان سب زور و تکبر کا پتلا بن جاتا ہے تو غرور و سرکشی پر اتر آتا ہے۔ خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی ذہنیت کو فرعونیت اور قارونیت کے عنوان سے تعبیر کیا۔

ان قارون کان من قوم موسى فبغى عليهم واتيناها من الكنوز ما ان مفاتحه  
لتنود بالعصبة اولى القوة اذ قال له قومه لا تفرح ان الله لا يحب الفرحين  
وابتغ فيما اتاك الله الدبار الاخرة ولا تنس نصيبك من الدنيا واحسن كما  
احسن الله اليك ولا تبغ الفساد فى الارض ان الله لا يحب المفسدين

بیشک قارون موسیٰ کی قوم سے تھا۔ پھر اس نے ان پر زیادتی کی۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے  
دیئے، جن کی کنجیاں ایک زور اور جماعت پر بھاری تھیں۔ جب اس سے اس کی قوم نے  
کہا، اترا نہیں۔ بیشک اللہ اترنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور جو مال تجھے اللہ نے دیا  
ہے، اس سے آخرت کا گھر طلب کر۔ اور دنیا میں اپنا حصہ نہ بھول اور احسان کر، جیسا اللہ  
نے تجھ پر احسان کیا۔ اور زمین میں فساد نہ چاہ۔ بیشک اللہ فسادیوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(القصاص، ۶۶، ۶۷)

ایک اور مقام پر دو بھائیوں کے مکالمہ سے اس ذہنیت کو بیان کیا گیا کہ ایک کے پاس ننانوے  
بھیڑیں تھیں اور دوسرے کے ہاں ایک۔ دوسرے نے پہلے سے کہا کہ کچھ بھیڑیں دے کر تمہیں میری کفالت  
کرنی چاہئے۔ تو اس نے جواباً کہا کہ اگر یہ ایک بھیڑ بھی مجھے ہی دے دے، تو میری پوری ایک سو بھیڑیں ہو  
جاتیں گی۔

غیر مشروط انفرادی ملکیت، ذخیرہ اندوزی بے مروتی و زبردستی اور باطل طریقوں سے مال گزاری کی اسلام  
نے بھرپور مذمت کی ہے۔ اس کی ضد میں جس اجتماعی ملکیت کے نظم معیشت نے جنم لیا۔ بظاہر بڑا  
مغرب ہے۔ زر، زن اور زمین میں اجتماعی شرکت کا نعرہ بہت پہلے ایران میں بھی بلند ہوا تھا۔ سپار

مابین لیکادگانے اس کے اصول بھی وضع کئے۔ لیکن عملی طور پر اس فلسفہ کو پیش کرنے میں کارل  
ارکس، انجلز، لینن اور ماؤتے تنگ کے نام سرفہرست آتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے اشتراکیت، سوشلسٹ اور مارکسیت دونوں نے فلسفہ مادیت اور فلسفہ انکار کے  
یٹ سے جنم لیا ہے۔ مؤخر الذکر پر علامہ اقبال نے بڑا فکر انگیز تبصرہ کیا ہے۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ لاکلیسا لاسلاطین لالہ

دین آل پیغمبرے ناحق شناس بر مساوات شکم دار و اساس

اسلام نے اعتدال کی راہ بتائی۔ کہ در حقیقت یہ سب کچھ نہ فرد کے لئے ہے کہ اپنی ذات کے مقابلہ  
مجماعت کو کوئی حیثیت نہ دے اور نہ جماعت کے لئے ہر فرد چیز با اقتدار شخصیتوں کے رحم و کرم پر ہے  
یہ انسان کو پہلے سے یہ ذہن نشین کر لیا کہ :-

لہ ما فی السموات و ما فی الارض۔

اُسی کے لئے ہے جو کچھ زمینوں میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے۔

اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ خدا تعالیٰ کی توفیق شامل حال نہ ہو تو تمہارے بس میں کچھ بھی نہیں۔

انتم تزرعونہ ام نحن الزارعون

کیا تم اس کی کھیتی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں۔ (الواقعہ، ۶۴)

انتم انزلتموه من المزن ام نحن المنزلون

کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم اتارنے والے۔ (الواقعہ، ۶۹)

یہ ہے تو سب کچھ اسی کا۔ انسان تو محض ایک "ابن متصرف" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی  
یافتش ہے کہ کون اس کی حاکمیت پر ایمان رکھتے ہوئے ان پابندیوں میں رہ کر ان نعمتوں کو تصرف  
کرتا ہے۔

و ما رزقناہو ینفقون۔ (البقرہ، ۲۱۱)

اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں لٹائیں۔

نظم معیشت و تقسیم دولت اور معاشی طور پر مفلوک الحال افراد کی کفالت سے متعلق قرآن پاک کی واضح آیات موجود ہیں۔ البتہ یہ نظام معیشت صرف اسی ریاست میں نافذ ہو سکتا ہے۔ جو اللہ رب العزت کی ربوبیت پر راضی ہیں۔ اس کی مالکیت پر ایمان کامل رکھتے ہیں۔ اور اس کی حاکمیت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

یہ وہ تصوراتِ ثلاثہ ہیں جو انسان کو حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق النفس کی حسن ادائیگی کا سلیقہ عطا کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں معاشی خوشحالی کی اہمیت کا مسئلہ آتا ہے۔ کیونکہ معاشی خوشحالی صالح معاشرہ کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ اور یہی اسلام کا مقصود ہے۔ نتیجہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ معاشی خوشحالی روحانی مسرتوں اور ابدی سعادتوں کے حصول کیلئے راہگزر کا کام دیتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

الدنيا مزرعة الاخسرة۔

نہ یہ کہ انسان مادی اقدار کو آخری منزل قرار دے کر خود خالقِ اقدار بن بیٹھے۔

جانز احتیاجات کی تسکین عقلاً و شرعاً ممنوع نہیں۔ خود اسلام نے بقائے ذات اور اتصالِ جسم و روح کے لئے ان ضروریاتِ حیات کو ہر انسان کا بنیادی حق قرار دیا۔

ان لك الاتجوع ولا تعري وانك الا تنظمو فيها ولا تفضي۔

اور تیرے لئے ہے کہ نہ تو بھوکا رہے اور نہ ننگا اور یہ کہ نہ تو پیاسا رہے اور نہ بغیر مکان کے

کڑی دھوپ میں۔

اگر مادی نعمتوں کو کمالاتِ انسانی کی منزلِ رفیع کے لئے سنگِ میل جان کر استعمال کیا جائے، تو یہی

مال انسان کے حق میں "خیر" "فضل اللہ" "زینت" "سکون" اور "سہارا" ہے۔

فاذا قضيت الصلوة فانتشروا في الارض وابتغوا من فضل الله۔

پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ۔ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

انفقوا خيرا لانفسكم۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کر دینے بھلے کو۔ تغابن۔

اور اگر یہ جہد و جہد صرف نفسِ امارہ کی اتباع میں ہو تو یہی حال اس کے حق میں "غور" "فتنہ" اور "دشمن" بن جاتا ہے۔

انما اموالکم و اولادکم فتنۃ. (تغابن، ۱۵)

تمہارے مال اور تمہارے بچے جانچ ہی ہیں۔

اسی تفریق کو حلال و حرام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حلال طریقہ سے کمایا ہوا مال سہا لہ ہے۔ زینت ہے سکون ہے۔ اللہ کے فضل و احسان اور اس کی طرف سے خیریت اور سلامتی کا نشان ہے۔ اور حرام مال آخرت میں تو موجبِ خسارہ ہے ہی۔ دنیا میں بھی اس کی فتنہ ساز مایموں سے معاشرتی اور اخلاقی اقدار بخرچ ہوتے ہیں۔ قرآن و سنت کی رُوسے رزقِ حلال کی تلاش عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

وجعلنا الليل لباسا وجعلنا النهار معاشا (النبا، ۱۱۱)

اور رات کو پردہ پوش کیا۔ اور دن کو روزگار کیلئے بنایا۔

لیس علیکم جناح ان تبغوا فضلا من ربکم ط

تم پر اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

من الذنوب ذنوب لا یکفرها الا اللہ فی طلب المعیشتہ. (الحديث)

کتنے گناہ ہیں جن کا کفارہ فکرِ معاش اور اس کی جہد و جہد ہے۔

التاجر الصدوق بحشر یوم القيامة مع الصديقين والشهداء.

سچے تاجر کا حشر قیامت کے روز شہداء اور صدیقین کے ساتھ ہوگا۔ (الحديث)

فقر سے دین کی نرمی، عقل کی محرومی، لوگوں میں حقارت اور بے مروتی پیدا ہوتی ہے۔ اسلام نے

گداگری کی لعنت سے بچنے کی تلقین کی۔ ایک مرتبہ رسول اللہ نے فرمایا

من طلب الدنیا حلالا لا تعفوا عن المسئلة وسعی علی عیالہ و تعطفاً

علی جارة لقی اللہ و وجہہ کالقمر لیلة البدر. (الحديث)

جس نے سوال سے بچنے، کنبہ کی کفالت کرنے اور پڑوسیوں کے لئے معاونت و عاطفت

کی غرض سے دنیا یعنی مال و دولت طلب کی، وہ روز قیامت خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوگا تو اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح تابندہ ہوگا۔  
 حلال و حرام کی تیز معاشی ناہمواری اور عدم مساوات کو دور کرتی ہے۔ عام طور پر یہ ناہمواری اور طبقاتی اوپر نیچ "کتاب زر" "سرف زر" اور "ارتکاز زرت" کے باطل ذرائع سے ہوتی ہے، جو افعالی، روحانی، جسمانی اور معاشی اقدار صحت کے لئے ضرر۔ سال ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا. (الآیہ)  
 اے لوگو! زمین سے حلال اور پاکیزہ کھاؤ۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَدُلُّوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لْتَأْكُلُوا  
 فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْأَثَرِ (البقرہ، ۱۸۸)  
 اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس  
 لئے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھاؤ۔

کسب معاش میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی قیود سے وہ تمام راہیں مسدود کر دی ہیں جن میں  
 دوسرے شخص کی ضرورت، سادہ لوحی، نا تجربہ کاری اور مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔  
 سود، ہوا، ذخیرہ اندوزی، رشوت، ملاوٹ، چوری، دھوکہ بازی، بلیک مارکیٹنگ اور دیگر اس قسم کی  
 دھاندلیاں اسلام کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ اس کے لئے تاویبی کا وٹنی لازمی ہے۔ شریعت اسلامی نے  
 معاشی خوشحالی اور اخلاقی قدروں کے تحفظ کے لئے جامع اور مستقل قوانین وضع کئے ہیں۔ اور پھر اس  
 رزق کا تعلق اخلاقی اور روحانی قدروں سے قائم کرتے ہوئے یہ تلقین کی کہ استجابِ دُعا، اکل حلال اور  
 صدق مقال کی متقاضی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا حال بیان فرمایا، جو پرگندہ سر  
 پریشان بال اور پٹھے پرلنے پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس ہے۔ اور دستِ دُعا، بارگاہِ ایزدی میں دست  
 کرتا ہے۔ لیکن دعا، شرف قبولیت سے محروم رہتی ہے۔ کیونکہ اس کا کھانا حرام، اس کا لباس حرام اور



حرام ہی سے اس کا گوشت پوست تیار ہوا ہے۔

ایک اور حدیث پاک میں آتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، وہ آدمی جو حرام ذریعہ سے مال جمع کرتا ہے، وہ خوش نہ ہو۔ اگر وہ اس سے خیرات بھی کرے گا تو وہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ اور جو باقی رہے گا وہ جہنم کے لئے زادِ راہ ثابت ہوگا۔

معاشی نقطہ نگاہ سے اگر غور کریں تو معلوم ہوتا کہ معاشی عدم توازن اور غیر متوازی حالات نے تقاضا  
دولت کی اساس وہی وسائل معاش میں جنہیں اسلام نے حرام قرار دیے دیا۔

”صرف زر کے لئے اسلام نے ایک فطری طریق کار وضع کیا۔ اور اس بات کا خصوصی طور پر رکھا گیا کہ مال و دولت کسی بھی ایسے انداز میں خرچ نہ ہونے پائے، جو اخلاقی و روحانی قدروں اور معاشی توازن میں بگاڑ پیدا کر سکے۔ مجنون اور نابالغ بچے کو مال تفویض نہ کرنے میں یہی حکمت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ولا توتوا السفهاء اموالکم الی الی جعل اللہ لکم قیاماً۔

اور یہ مال کم عقل لوگوں کے سپرد نہ کرو، جسے اللہ کریم نے تمہارے لئے سہارا بنایا۔

فصل خرچی کی سخت مذمت کی۔ اور بے جا گلچڑھے اڑانے والوں کو شیطان کا بھائی بتایا۔

ان البدین کانوا اخوان الشیاطین

بیشک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

انفاق مال کی جو راہیں اسلام نے متعین کی ہیں، تنبیح آیات سے اس میں بلحاظ درجات اپنا کتبہ فلانین  
رشتہ دار، عزیز پڑوسی، شہر کے نادار افراد، اور پھر اپنے ملک اور آخر میں عالم اسلام و عالم انسانیت کے  
فلاح و بہبود اور معاشی اجتماعی کفالت کے لئے تمام تر شعبوں موجود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے جا دولت کے مصرف سے منع فرمایا۔ اور محض نمود و نمائش  
کے لئے اصراف کے درپے رہنے والوں کو درس و عظمت دیا کہ

ابدء بمن تعول۔ اس سے شروع کر جس کا مال و نفقہ تمہارے ذمہ ہے۔

طبقاتی کشمکش عموماً غیر متوازن نظم معیشت کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسلام نے ایک قابل ضبط نظم معیشت پیش کیا جس میں انتقالِ دولت کا خصوصی انتظام ہے۔ قرآن مجید نے رسول اللہ علیہ السلام کے منصب رسالت میں یہ بھی ذکر کیا کہ آپ اغنیاء سے مال لیتے ہیں اور غریبوں میں تقسیم فرماتے ہیں۔ اور اس کی قلت یوں بیان فرمائی۔

کی لایکون دولة بین الاغنیاء منکھد

تاکہ دولت صرف امراء ہی میں گردش کناں نہ ہے۔

قوانین وراثت، اموال فنی، زکوٰۃ، رکان، عشر اور کفارات مالیک کے علاوہ مصاحح مرسلہ کے ضمن میں آنے والے واجبات دولت کو گردش میں رکھتے ہیں۔ یوں دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہیں رہ جاتی۔ سود کی حرمت میں بھی یہی حکمت کار فرما ہے۔ کیونکہ مارکیٹ پر صرف چند ہاتھوں کا تصرف قیمتوں کے نظام کو بالکل مصنوعی بنا دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت کا رد عمل، ناجائز منافع خوری کے بڑھے ہوتے رجحانات، رسد و طلب کا خشک علاقہ، مزدور اور کارخانہ دار، کسان اور زمیندار کے مابین طبقاتی آویزش کو جنم دیتا ہے۔

اسلامی نظام معیشت میں طبقاتی منافرت کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ اس نظام میں مزدور سرمایہ دار، کسان اور زمیندار خدا تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے ایک مشترکہ مقصد کے لئے ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر معاشرہ کی اجتماعی فلاح ہوتی ہے۔ محض ذاتی منفعت اس مادی دوز میں محرک نہیں۔ تاہم ہر طبقہ کے حقوق و فرائض کا ضابطہ اسلام نے پیش کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اعطوا الاجیر اجرة قبل ان یحفر عرقہ۔ الحدیث۔

مزدور کو اس کی مزدوری دو پیشتر اس کے کہ اس کا پسینہ خشک ہو۔

وہ اس کے مقابلہ میں ان مزدوروں کو بھی شامل کر دینا کہ انجام سے خبردار کیا،

جو دیانتداری سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برتتے ہیں۔ حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام

کے باہمی معاملات میں اچھے مزدور کی تعریف و توصیف "قوی" اور "امین" سے بیان کی گئی۔ اور آبرو کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ ابیر پر وہ مشقت نہ ڈالے جو اس کی قوت برداشت سے باہر ہو۔ مزارعت سے متعلق تقسیم اراضی، لگان، کسان اور مزدور کے باہم تعلقات اور تعاون کی مختلف صورتوں کے بارے میں حضرت عمر نے جن قواعد و ضوابط کا تعین فرمایا، وہ آج بھی اسی طرح افادیت کے حامل ہیں۔

رہا تجارت کا مسئلہ تو اسلام نے اس کے بارے میں رہنما اصول وضع کئے ہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیشہ کو اختیار فرمایا۔ باہمی رضامندی، صاف گوئی اور دیانتداری اسلامی تجارت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ملاوٹ، دھوکہ دہی اور غیر معیاری اشیاء کی فروخت اور استحکار (HOARDING) ممنوع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مَنْ عَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا۔ اور یہ کہ چالیس دن تک جنس اس لئے روک کر رکھنے والا کہ مصنوعی قلت پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر کے اللہ کے ذمہ کرم سے محروم رہتا ہے۔ مشارکت اور مضاربت کے اصولوں پر تجارت کی عام اجازت ہے اور بینکوں کے لئے بھی بلا سود قرضہ جات اور مشترکہ کمپنیوں کے ذریعے مشارکت اور مضاربت کی سفارش موجود ہے۔ اسلامی بینک بابت المال اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اسلامی بینک کے محاصل مندرجہ ذیل ہیں۔

زکوٰۃ، عشر، خمس، صدقات اور جزیہ کے علاوہ حکومت وقت ہنگامی ضروریات کے پیش نظر زائد ٹیکس (نواب) بھی لگا سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان کے جماعتی مفادات ظاہر و باہر ہوں۔ آمدنیوں کے لحاظ سے ان کے مصارف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ آمدنیاں جن کے مصارف کی وضاحت قرآن مجید نے کر دی، مثلاً مالِ غنیمت کا مصرف، محصول، زکوٰۃ کا مصرف۔ ان آمدنیوں میں امام محض ایک امین اور واسطہ ہے۔ دوسری قسم کی آمدنیوں مثلاً محصول، خراج، محصول جزیہ اور عشر وغیرہ سربراہ مملکت اپنی کابینہ کے مشورے سے ملکی بہبود کے دیگر کاموں میں صرف کرنے کا مجاز ہے۔

فقہائے اسلام نے اسلامی بیت المال کی آمدنیوں کے مصارف کا باقاعدہ ایک نظام ترتیب دیا ہے۔ اس میں ملکی صنعت و سرفت اور تجارت کو فروغ دینے کے علاوہ اجتماعی کفالت کی ضمانت موجود ہے۔ رسول اللہ کا ارشاد گرامی ہے۔

من ترك مالا فلورثته ومن ترك كلاً فاعلىٰ

جس نے مال ترک میں چھوڑا تو وہ اس کے ورثاء کا ہے۔ اور جس نے تمیم چھوڑا وہ میرے ذمہ میں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیروزگاری افلاس اور عزت کے خاتمے کے لئے بیت المال میں جمع ہونے والی خطیر قوم سے فیصلہ کن کردار ادا کیا جاسکتا ہے۔ عزت و افلاس کے خاتمے کے لئے اسلام کے زکوٰۃ سسٹم کو بنظر عمیق دیکھا جائے اور پھر صدقات و خیرات کے فلسفہ پر غور کیا جائے تو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ فقر و فاقہ کے خلاف جہاد کی تحریک میں اسلام موجودہ دور کے مختلف ازموں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ منصفانہ حل پیش کرتا ہے۔

# نظام مصطفیٰ

## کی خارجہ پالیسی

اسلام اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے عالمگیر امن و سلامتی اور خیر و فلاح کا ضامن ہے۔ عالمی سطح پر انسانی حقوق کی پاس داری اور کم گنتگان راہ کو جادہ حق پر لانے کی عظیم محنت کو شش امت مکمل طور پر کا منشور ہے۔ نیکی کی بالادستی اور برائی کی یخ کنی امت وسط اور خیر امت کا نصب العین ہے۔ جہاں اسلام نے ریاست اسلامیہ کے داخلی استحکام کے لئے عظیم متغیر، غیر متبدل اور بھروسہ اصول فراہم کئے ہیں، وہاں سیاست خارجیہ اور غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات خارجہ کی بنیادیں بھی مہیا فرمائیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ریاست کی تشکیل فرمائی، اس کی خارجہ پالیسی کے مبادیات میں تبلیغ دین اور اس انقلابی دعوت کو عام کرنا ہے۔

### تبلیغ اسلام

اسلام چونکہ ایک عظیم فکری دعوت اور عملی نظام ہے، جس سے کشت حیات کا ہر گوشہ سیراب ہوتا ہے۔ اور یہی وہ خدا تعالیٰ کا آخری اور پسندیدہ دین ہے۔ دنیاوی اور آخری فوز و فلاح کا ضامن ہے۔ اس لئے امت مسلمہ پر یہ ذمہ داری ٹانگی گئی کہ وہ یہ پیغام حق دُنیا کے کونے کونے میں پہنچائے۔ اس لئے تعلقات خارجہ میں بنیادی پالیسی یہ ہے کہ سفارتی تعلقات اور دیگر معاہدات وغیرہ سے غیر مسلم ریاستوں میں مؤثر طریق پر تبلیغ دین کا فریضہ سر انجام دیا جاسکے۔

### غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات

غیر مسلموں کے ساتھ تجارت کرنا، مشترکہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ان کے ساتھ فوجی پیکٹ کرنا، عام میں

جول اور معاشرت میں غیر مسلموں سے حسن سلوک اور خندہ پیشانی سے پیش آنا قطعاً ممنوع نہیں۔ اور خصوصاً وہ غیر مسلم ریاست جو اسلامی تحریک کی ارشاد و تلقین کے لئے سنگ راہ نہیں بنتی ہے، اور اپنی مسلم رعایا کو ظلم و استبداد کا نشانہ نہیں بناتی ہے۔ اور مسلم ریاست کے خلاف معاندانہ کاروائیوں میں حصہ نہیں لیتی۔ اس سے خیر و فلاح پر تعاون کی اجازت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

لَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ هُمْ لِيَقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُواكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبْرُوهُمْ وَتَقْطُوبُوا بِهِمْ إِنْ اللَّهُ يَجِبُ الْمَقْطُوبِينَ. اللَّهُ  
وہ لوگ جو دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کرتے۔ اور نہ ہی انہوں نے تمہیں گھروں سے نکالا۔ ان کے ساتھ برّ اور احسان اور انصاف کرنے سے اللہ تعالیٰ منع نہیں فرماتا ہے۔ اور اللہ نے انصاف کرنے والوں کو پسند فرمایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے جو معاہدہ فرمایا جسے "میشاقِ مدینہ" کے نام سے تاریخ اسلام میں یاد کیا جاتا ہے، اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کی اساس مہیا کرتا ہے۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد نبی حمزہ اور بنی مدینہ کے علاوہ دیگر قبائل سے فوجی، سیاسی اور تجارتی نوعیت کے معاہدات ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر دفعات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام عالمی امن و امان کا کس قدر احترام کرتا ہے۔ ان معاہدات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف اپنے موقف کی وضاحت فرمائی۔

ان معاہدات و موافقت کی عبارات کچھ اس طرح تھیں۔

\* یہ کہ انہیں ان کے مال اور ان کی جان پر امن ہے۔

\* اور یہ کہ انہیں ہر ایسے کے خلاف مدد دی جائے گی، جو ظلم سے ان پر اچانک ٹوٹ پڑے

اور ان پر واجب ہے کہ وہ بنو صخرہ کی مدد اس وقت تک کرتے رہیں، جب کہ سمندر کسی

ساحل کو گھیرا کرتا ہے بجز اس کے اللہ کے دین کے باسے میں وہ ہم سے جنگ کریں۔ ان پر

اس باسے میں اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے۔

\* اور انہیں مدد اس شرط پر دی جائے گی کہ وہ وعدہ دفائی کرتے رہیں اور عمدگی سے پختے رہیں۔

یہود سے جو پیشاق ہوا اس میں ایک شرط یہ بھی تھی۔

”اگر کوئی مدینہ پر حملہ آور ہو تو وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔ اور اگر ان کے علاقہ پر کوئی چڑھائی کرے تو مسلمان مدد دیں۔ البتہ جارحانہ پیشقدمی میں غیر جانبداری برتی جائے۔“  
صلح حدیبیہ میں تجارتی تعلقات کی ایک شق معاہدہ یہ بھی تھی۔

”دس سال تک باہم صلح رہے۔ ایک دوسرے کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں۔ اور تجارت وغیرہ ضرورتوں سے ایک دوسرے کے علاقے سے گزرنے کی اجازت ہو۔“

اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے جو حج، عمرے یا تجارت کے لئے مکہ آئے تو اس کی جان و مال کو امان ہوگی۔ اور قریش کا جو شخص تجارت کے لئے مصر یا شام جاتے ہوئے مدینے سے گزیرے تو اسے جان و مال کی امان ہوگی۔“

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معاہدات میں شرکت کی عام اجازت بھی بخشی۔ صلح حدیبیہ میں فریقین معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ اس معاہدہ کی شرائط پر کوئی بھی قبیلہ مسلمانوں یا قریش کا حلیف بننا چاہے تو وہ بن سکتا ہے۔ معاہدہ کی اس شق کا ترجمہ یہ ہے۔

”یہ کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدے میں اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے، وہ بھی ایسا کرے گا۔ اور جو قریش کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے، وہ بھی ایسا کرے گا۔“

اسی موقع پر بنو خزاعہ نے مسلمانوں کا اور بنو بکر نے قریش کا حلیف بننے کا اعلان کیا۔ اور یوں وہ بھی اس معاہدے میں شریک ہو گئے۔

### صلح و امن کے قانون

اگر کوئی غیر مسلم ریاست تشدد کی پالیسی اختیار نہیں کرتی، بلکہ صلح و دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے تو اسلام اپنے ملنے والوں کو ترغیب دیتا ہے کہ تعادل کے لئے بڑھتے ہوئے اس ہاتھ کو پکڑ لو۔ اور صلح و خیر سگالی کی اس پیشکش کا احترام کرو۔

فان اعتزلوكم فلم يقاتلوكم والقوا اليكم السلم فما جعل الله لكم  
عليهم سبيلا وان جنحوا للسلم فاجنم لها۔ الآية۔

اگر وہ باز آجائیں، اور تمہارے ساتھ قتال نہ کریں۔ اور صلح کی درخواست کریں تو اللہ تعالیٰ  
نے تمہارے لئے دوسری راہ (یعنی جنگ و غیرہ لازم نہیں کی۔ اور اگر وہ صلح کے لئے جھک  
جائیں تو ان کے لئے صلح کے واسطے آمادہ ہو جاؤ۔

دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں امن عامہ اور صلح کل کی پاس داری کا کس قدر اہتمام ہے۔ کہ اگر غیر  
مسلم بظاہر صلح پر آمادہ ہو، اگرچہ اندر ہی اندر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تیاریاں کر رہا ہو تب بھی  
ترغیب یہی ہے کہ صلح کے لئے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دو۔ بلکہ بڑی گرجوشی سے اسے تمام لو۔  
معاہدات کی پابندی

معاشی و تجارتی یا فوجی نوعیت کا معاہدہ ہو،۔ تو مکمل پابندی امت مسلمہ کا طرہ امتیاز ہے۔ تاریخ  
اسلام کے درق اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے معاہدہ کی ہر شق کا احترام کیا۔ معاہدات  
کی صحیح پاس داری ہی سے امن و صلح کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے قرآن و حدیث میں ایسے عہد  
پر سخت زور دیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعَهْدِ  
اے ایمان والو! عہد کو پورا کرو۔

أَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا

عہد پورا کرو۔ بے شک عہد کی پابندی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

أَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا إِلاَّ  
جب تم عہد کرو تو اللہ کے ساتھ عہد کو پورا کرو۔ اور پختہ کرنے کے بعد اپنی قسموں کو نہ توڑو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد کو علاماتِ نفاق میں شمار کیا۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں  
دنیا کی منڈب قوموں نے بین الاقوامی معاہدات کو کاغذ کی محض پرچیاں سمجھ کر ان کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اسی



لئے آج باہمی معاہدات ہونے کے باوجود تمبیری عالمی جنگ کی تلوار پوری دنیا پر شک ہے۔ اسلام ایسی پالیسی کی زبردست مدد کرتا ہے۔ نقض عہد کی ہر غیر اخلاقی اور غیر قانونی شکل ممنوع ہے۔ اور مدت مقررہ تک عہد کی پاسداری کا حکم دیتا ہے

وَاتِمُوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ لِمُدَّتْ لَكُمْ دَلَالِيهِ

اور اپنا عہد مدت مقررہ تک مکمل کرو۔

اگر فریق معاہدہ خلاف ورزی کرتا ہے یا اس کی طرف سے معاہدہ میں خیانت کا قوی شائبہ ہو تو بھی مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعلان نقض معاہدہ کے بغیر کوئی کاروائی نہ کریں۔ یہ وہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے، جسے آج بھی بین الاقوامی امن و جنگ کے قوانین میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اللہ کریم کا ارشاد ہے۔

وَأَصَاتِحَافِن مِّن قَوْمٍ مِّنِيَانَةٌ فَاَنْبَذَ إِلَيْهِمْ عَلِي سَوَاء

اور اگر کسی قوم سے خیانت کا خوف رکھو تو معاہدہ ان کے ہاں پھینک دو (یعنی توڑ دو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحِلُّنْ عَقْدُهُ حَتَّى يَنْقُضَ عَهْدَهُمْ

اور بینہ الیہم علی سواد۔ الحدیث۔

اگر تم میں سے کسی شخص اور کسی قوم کے درمیان معاہدہ ہو تو اس معاہدے کو کوئی نہ کھولے، حتیٰ

کہ وہ اپنے عہد کو توڑ دے یا پھر علی الاعلان عہد سے دستبردار ہو۔

اسی طرح اگر کسی قوم سے معاہدہ ہو اور ان کے مشکوک رویے سے ایسے آثار دکھائی دیتے ہوں کہ

وہ اب عہد شکنی پر آمادہ ہیں اور دشمنان اسلام سے ساز باز کر رہے ہیں، تو بھی ان پر اچانک حملہ نہ

کیا جائے۔ بلکہ پہلے معاہدہ سے دست برداری کا اعلان کر دیا جائے۔ اور وہ کھلی غداری

اور خیانت پر اتر آئیں تو اعلان کی ضرورت نہیں۔ حالات کی نزاکت کے اعتبار سے مناسب

اقدام کیا جاسکتا ہے۔

## عدم مصالحت کی صورت میں

جو غیر مسلم تبلیغ دین کے اس مشن میں آئے کتے ہیں، مسلمانوں کے لئے جو روحِ حفا اور ظلم و استبداد کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ ایسے لوگوں سے نرمی اور حسن سلوک کی اجازت نہیں۔ ویسے بھی کسی آزاد اور غیرت مند قوم کے شایان شان نہیں۔ اور پھر ملتِ اسلامیہ کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ ادھر اپنے دینی بھائی ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہیں۔ اور ادھر ان سے معاشقہ اور محبت کی پینگیں بڑھاتے رہیں۔ ایسے لوگ کسی احسان اور لطف و کرم کے مستحق نہیں۔ اور یہی لوگ ہیں، جن کے بارے میں قرآن مجید کی ہدایت ہے۔

إِنَّمَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ فَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ  
وَمَا ظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَطْلُبُوا عَلَيْهِمُ ۗ

بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے (دوستی) سے منع کرتا ہے، جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی۔ تمہیں گھروں سے نکال دیا۔ اور تمہیں نکالنے پر مدد کی، کہ تم ان سے دوستی رکھو۔ اور جو انہیں دوست بنا تیں، پس بیشک وہ ظالم (باغی) ہیں۔

اور دوسرا کفار سے ایسے مراسم ممنوع ہیں کہ اپنے معاملات میں سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا جائے اور مہربانیاں میں ان ہی کے مشورے پر مکمل اعتماد کیا جائے، یا ان کی جانبداری میں کسی دوسری مسلم ریاست کو نقصان پہنچے۔ دین کی رسوائی ہو، دینی بھائیوں کو اذیت پہنچے، یا ان کا وقار اور مفاد مجروح ہو۔

لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ

اپنے غیروں کو رازدان نہ بناؤ۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ

مومنوں کے مقابلہ میں کافروں کو مومن دوست نہ بنائیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تَلْقَوْنَ إِلَيْهِمْ

بالمودة وقد كفروا بما لبسوا من الحق يخرجون الرسول وأياكم

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان سے مودت کا سلسلہ شروع کرو۔ حالانکہ انہوں نے دینِ حق سے کفر کیا۔ تمہیں اور رسول اللہ کو گھر سے نکالتے ہیں۔ آیاتِ بالا میں "بطانۃ" "دون المؤمنین" اور "یخرجون الرسول" پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم مصاحبت اور جنگی کارروائی اس وقت لازمی ہے جب وہ مسلم ریاست کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کرنا چاہیں یا مسلم رعایا کو ان کے اسلام کی وجہ سے نشانہ ظلم و ستم بنائیں۔ جہاں اس دفع ظلم اور قیام امن کے لئے مشروع ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِي كُفِّرْتُمْ عَنْهُ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا الْآيَةَ۔

تمہیں کیا ہوا، اللہ کی راہ میں قتال نہیں کرتے۔ حالانکہ کمزور مرد عورتیں اور بچے بلک بلک کر پکار رہے ہیں، کہ اے اللہ ہمیں ظالموں کے شر سے باہر نکال۔ اور اپنی طرف سے دوست اور مددگار بنے۔

### ملک کی سالمیت

انہی آیات سے اسلامی ریاست کے دفاع اور وفا کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ یوں اس وطن کی سالمیت اور استحکام خارجہ پالیسی کی اہم کڑی ہے۔ اور وہ جملہ تعلقات خارجہ جس سے ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کو نقصان پہنچے۔ یا ایسے معاہدات و ثقافت یا کلچر کے عنوان سے کیوں نہ ہوں۔ اگر افراد ریاست کی اخلاقی اقدار کو متزلزل کر دیں تو جانز نہیں۔

### مسلم ریاستوں سے تعلقات

دوسری مسلم ریاستوں کے ساتھ تعلقات معاہدہ اسلام کی بنیاد پر قائم ہیں۔ کسی مسلم ریاست کو ایسے معاہدہ میں شرکت کی اجازت نہیں جو کسی مسلم ریاست کے خلاف جارحانہ کارروائی کو متضمن ہو۔ کیونکہ یہ ملتِ اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے مترادف ہے۔ اور بالخصوص آج عالم اسلام کو باہمی جنگ و

جدال کی آگ میں جھونکنے کی تمام ذمہ داری اُن ارباب بست فکشا پر ہے، جنہوں نے غیروں کی خوشنویں کے لئے اپنے دینی بھائیوں کے خلاف محاذ آرائی میں حصے کر و وحدت اسلامیہ کو زبردست نقصان پہنچایا۔ کل مسلم ریاستیں انحراف اسلامی کے مضبوط رشتے سے ایک وحدت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاہم دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ملت اسلامیہ کے مختلف گروہوں کا ان کی اپنی الگ الگ نوعیت کے لحاظ سے ان کے باہمی، دینی، سیاسی اور معاشی تعلقات اور حقوق و ذرائع کی نوعیت بیان کر دی گئی۔

وہ مسلمان جو غیر مسلم ریاست کی رعایا ہیں، بخوشی اس کی شہریت قبول کر لیں۔ دینی برادری کا لحاظ سے بے شک ان سے برادرانہ تعلقات نہیں لیکن سیاسی نقطہ نگاہ سے وہ مسلم ریاست کے ذمہ حفاظت سے باہر ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يهاجروا مَا لَكُمْ مِنْهُ وَلَا مِنْهُمْ مِنْ شَيْءٍ وَهُتَىٰ  
يهاجروا ط اللہ۔

اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت نہ کی تو تم پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں حتیٰ کہ وہ بھی ہجرت کر لیں۔

اور اگر وہ ظلم و ستم کا شکار ہو جائیں تو مسلم ریاست کا یہ دینی فرض ہے کہ وہ سفارتی سطح پر بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں ان کی مدد کریں۔ ہر صورت میں ریاستی قوانین کی پاسداری اور اس کا احترام قیام امور کے لئے ضروری ہے۔ ایسی صورت اگر پیدا ہو جائے تو اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ۔

وَإِنِ اسْتَفْرَدَكُمُ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ ابْنَيْكُمْ  
وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ ط اللہ۔

اور اگر وہ دین کے معاملہ میں مدد مانگیں تو تم پر مدد لازم ہے۔ ہاں؛ مگر اس قوم پر نہیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے۔

اس رو سے دولت اسلامیہ کی ذمہ داری ان مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر

ہیں۔ باہر کے مسلمانوں کا ذمہ اس کے سر نہیں۔ یہ وہ بات ہے جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

أَنَا بَرِيٌّ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ بَنِيَنَ ظُهُرِيَّ الْمَشْرِكِينَ.

میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان رہتا ہے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابو جندل اور حضرت ابو بصیر کے ساتھ ہی معاملہ درپیش ہوا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کی پاس داری کرتے ہوئے انہیں صبر و استقامت کی تلقین فرمائی۔ اور انہیں واپس بھیج دیا۔ تاہم ان پر اگر تعدی اور ظلم ہو تو بین الاقوامی قوانین کے مطابق انکی مدد کی جائے۔ اسلام کی خارجہ پالیسی میں سب سے زیادہ اہمیت خیر اور بھلائی کے فروغ پر ہے۔ بلا تیز رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود کے مسلم ریاست امن و انصاف اور حق دار کو اس کا حق دلانے اور خدمتِ انسانیت اور حقوقِ انسانیت کے تحفظ کی ہر کوشش میں دوسری قوموں کے ساتھ ہے۔ اللہ کریم نے ملتِ اسلامیہ کو بھلائی میں تعاون کرنے کا حکم دیا۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

نیکی اور پرہیزگاری پر تعاون کرو۔ اور گناہ و ظلم پر تعاون نہ کرو۔

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مسلم ریاست اپنی خارجہ پالیسی کے مخصوص طرز کے اعتبار سے صلح کل، امن و انصاف اور احترامِ انسانیت کو پوری دنیا میں دیکھنا چاہتی ہے ۛ

# اسلام کا نظامِ تعلیم

اسلام کے نزدیک انسانیت کا نقطہ آغاز علم و عرفان کی روشنی ہے۔ خالق کائنات نے علم و آگہی اور معرفت حقائق اشیاء کی صلاحیتیں ودیعت فرما کر خلافتِ ارضی کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ اور اپنی عظیم قدرتوں کا شاہکار بنایا۔ یہی آزمائش ہے کہ انسان ان خداداد صلاحیتوں کو کیوں کر استعمال کرتا ہے، اور یہ کہ علم و عرفان کی روشنی سے خاکِ ان تاریک میں اُجالا کرنے کے لئے اس کی کاوشیں خلیفہ اللہ فی الارض ہونے کی حیثیت سے اس کی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیاں کس حد تک خالقِ حقیقی کی رضا جوئی کے لئے ہیں۔

یوں تو انسان خدا تعالیٰ کی لاتعداد تخلیقات میں سے ایک ہے۔ لیکن ان سے غیر اور ممتاز ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے دُنیا کو تصرف میں لانے کے لئے بھیجا۔ شمس و قمر اس کی خدمت پر مامور ہیں۔ زمین اس کے لئے گونا گوں نعمتیں اُگل رہی ہے۔ مناظرِ قدرت اس کے لئے فردوسِ نگاہ ہیں۔ بحر و بر پر اس کی حکمرانی کا سکہ رواں ہے۔ یہ محض ایک حیاتیاتی کیرا نہیں، جس کی احتیاجات صرف مادی عناصر سے پائے تکمیل کو پہنچ سکتی ہیں۔ بلکہ اس جسمِ خاکی کے پیچھے ایک اور قوت بھی ہے، جو ہے تو غیر مرئی، لیکن انسان کو دوسرے اجسامِ مادی سے جدا کرتی ہے۔ دیکھتے نہیں، اگر انسان محض اس قدر وقامت اور جسمِ مادی کا نام ہے تو ان چلتے پھرتے مویشیوں اور اس میں کیا فرق ہے کہ بھوسہ کھا کر جن کی مادی احتیاجات (MATE) کی تسکین ہو سکتی ہے۔ اللہ اللہ! کیا خوب مقامِ انسانیت جو مادی دُنیا سے پرے روحانی

کمالات کے حصول کی منزل رفیع ہے۔ یہ انسان گوشت و پوست ہی کا نام نہیں۔ بلکہ جسم و روح سے عبارت ہے۔ دونوں کے تقاضے مختلف ہیں۔ "انسانیت" کو سمجھنے میں بڑے بڑے فلاسفوں نے ٹھوکریں کھائیں۔ کسی نے جسم طبعی کو سبھی کچھ سمجھا۔ اور انسان کو معاشی حیوان بنا کر رکھ دیا۔ کسی نے جسم طبعی کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور مادی دنیا سے کٹ کر رہ گئے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں رہ کر دنیا برت کر مادی و روحانی احتیاجات کی تسکین کا جامع دستور دیا۔

انسانی تاریخ میں ایسے بھی دور کئے، جب انسان نے مادی لذتوں کو مقصد آخر سمجھ لیا۔ اور عقل و فرد کے سارے نشمن پھونک ڈالے۔ یہ اشرف المخلوقات کبھی پتھروں کی پوجا کرنے لگتا ہے، اور کبھی سورج کی۔ جب قلب مرکز عشق الہی نہیں رہتا۔ نگاہ عبرت کا سامان تلاش نہیں کرتی۔ گوش نعمہ فطرت سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ تو وہ انسان بظاہر انسان ہونے کے باوجود انسانیت کی منزل رفیع سے گرجاتا ہے اور بقول قرآن مجید **أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ** (یہ چوپایوں کی طرح، بلکہ زیادہ گمراہ ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے غایت فضل و کرم سے بھٹکے ہوئے قافلہ انسانیت کو راہِ راست پر گامزن کرنے کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا جنہوں نے گم گشتگانِ راہ و اسیرانِ حرص و آز کو جھنجھوڑا، دعوتِ حق دی۔ اور فکر و عمل کو نیا رخ بخشا۔

چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ بھی اس کاٹھ سے کچھ کم پُر آشوب نہیں تھا۔ توحید کے وہ دیئے جو اب سید سابقین علیہم السلام نے روشن کئے تھے، تقریباً بجھ چکے تھے۔ ہر طرف بد اخلاقی، بے دینی اور جہالت کے گھاٹوں پ اندھیروں میں انسانیت اور شرافت دم توڑ رہی تھی۔ مختصر یہ کہ **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ** کی ہمہ گیر کیفیت طاری تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ علوم و معارف کا ایک خزانہ لائے۔ جمالت و ناخواندگی کی پُر ظلمت قضا میں **اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ**۔ کے پیغام سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ قرآنی دعوتِ فکر نے قلب و ضمیر کو جھنجھوڑا۔ اصنام پرستی اور باطل پرستی کی ہر ممکن صورت کو ختم کیا۔ غیر اللہ کی پرستش سے نجات دلائی۔ اور خالق

کائنات کے لئے سجدہ ریزی اور سپاس گزاری کے آداب سکھانے۔ رہنے سمیٹنے کے انداز بنانے۔ اور نظم معاشرہ کے گڑ سکھانے۔

در شہستانِ حرا خلوت گزید

قوم آئین و حکومت آفرید

عالم امکان کے آئینہ میں احوالِ واقعی کا جائزہ لیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ معاشرہ پھر اسی نتیجہ پر آگیا ہے، جہاں آج سے چودہ سو سال قبل تھا۔ وہی بے راہروی، شراب نوشی و قمار بازی بد اخلاقی و سود خوری، صرف عنوانات بٹے ہیں۔ معنون ایک ہی ہے۔ سود کو منافع کہا۔ حرام پر حلال کا لیل مٹکایا۔ پہلے پتھروں کے لات منات کی پوجا۔ اب باطل نظریات کے اصنام کی پوجا ہو رہی ہے۔ اسلامی نظامِ فکر میں ایسا انقلاب برپا کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ جس نے عرب کے، تہذیب و تمدن اور اخلاق و ثقافت سے نا آشنا افراد کو علوم و معارف کا عارف اور اسرارِ فرقانی کا رہنما بنا دیا۔ معلمِ اخلاق اور فاتحِ عالم بنا دیا۔

تمدنِ آفرین خلاق آئینِ جہانداری

وہ صحرائے عرب یعنی شہزادوں کا گوارہ

اسلام کو عملی طور پر اپنی انفرادی اور قومی زندگی میں بطور دستور حیات نافذ نہ کرنے سے نہ صرف خدا کی ناراضگی مولیٰ ہے۔ بلکہ اقوامِ عالم میں بھی معتوب ہوئے۔

نئی نسل میں دین سے دوری کے رجحانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور یہ کوئی غیر متوقع نہیں ہے۔

کیونکہ ہمارے اہل جو نظامِ تعلیم رائج ہے، وہ نہ ہماری اقدار کا حامل ہے اور نہ قومی ثقافت کا ترجمان؛ بلکہ لادینی فکر کا زبردست سیلاب جس میں ہماری ملی اقدار خست و خاشاک کی طرح بہتی جا رہی ہیں۔ اور

بقول اقبال

یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ نصیلم ایک سازش ہے

فقط دین و مروت کے خلاف



اس گھناؤنی سازش کی ایک واضح تصویر لارڈ میکالے کی رپورٹ سے منظر عام پر آئی ہے جس میں یہ کہا گیا کہ ہم ایسی ٹیم تیار کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے اور مخلوم طبقہ کے درمیان ترجمانی کا کام دے۔ اور وہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو گوشت و پوست کے اعتبار سے ہندی ہوں، لیکن ان کا طرز فکر، ذہنی رجحان اور طور طریقے فرنگی ہوں۔ نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

ذہنی غلامی جسمانی غلامی سے کہیں زیادہ ہلک ہو کر رہتی ہے، جو دیمک کی طرح خود اعتمادی کو چاٹ لیتی ہے اور گھن کی طرح قومی تشخص اور ثقافت کی بنیادوں کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ان مفادات سے بچنے کے لئے اور قومی و ملی اقدار و ثقافت کی عمارت کو استحکام بخشنے کے لئے اسلامی نظام تعلیم کا نفاذ ناگزیر ہے۔ یہی نظام ہماری دینی اقدار کا محافظ، اسلاف کی میراث کا امین اور خوابیدہ تہذیبی قوتوں کو جلا بخشنے کا ضامن ہے۔

آج جب مختلف حلقوں سے "اسلامی نظام تعلیم" کے نفاذ کا مطالبہ دہرایا جاتا ہے، تو ایک طبقہ اسے ناقابل فہم اور ناقابل عمل سمجھتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ مسکلم کے ان الفاظ کو سنتے ہیں اور پھر ان الفاظ کو اپنے مفہوم کا جامہ پہناتے ہیں جس کے نزدیک اسلام چند مخصوص کم و رواج اور عبادات سے عبارت ہے۔ وہ بہر حال یہی سمجھیں گے کہ اسلامی نظام تعلیم سے مراد نماز و روزہ کی رکعات کی تعداد جاننے کی ایک کوشش ہے اور بس۔ یہ مطالبہ سنتے ہی ان کے ذہن میں ایک ایسی شخصیت کا تصور ابھرتا ہے جو جتہ و دستار سے عبارت ہے۔ جسے معاشرہ میں بجز محراب منبر کے اور سماجی و اقتصادی اور حکومتی معاملات میں عمل دخل کا قطعی حق نہیں۔ اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہمارے اس مطالبہ میں "اسلام" اور "نظام تعلیم" کس مفہوم میں مستعمل ہیں تاکہ کسی قسم کے ابہام اور شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

"اسلام" کے لغوی معنی جھکنا، دعوت قبول کرنا اور امن و سلامتی کے ہیں۔ اول الذکر معنی کے اصبا سے اسلام عبودیت کا مل اور کامل سپردگی ہے۔ اور مؤخر الذکر کے اعتبار سے اسلام سماجی عدل و انصاف اور امن و سلامتی کا نام ہے۔ یا یوں کہیں کہ حقوق العباد اور حقوق اللہ کی حسن ادائیگی اسلام کا مقصود و معنی ہے۔ احساس بندگی اور احساس سپردگی وہ جوہر ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں

انقلاب پیدا کرتا ہے۔ باہمی معاملات میں وہ وہی راہ اپنے لئے متعین کرتا ہے جو اپنے رب کی مرضی اور منشا کے مطابق ہوتی ہے۔ نفسانی خواہشات کسی طرح بھی اس طرز عمل میں دخل نہیں ہو سکتیں۔ اور یہی احساس معاشرتی امن اور سلامتی کا باعث بنتا ہے۔ یوں اسلام ایک طرف خدا کے حضور میں جوابدہی کا تصور ابھار کر اصلاح نفس کا کام لیتا ہے اور دوسری طرف صالح اور پاکیزہ معاشرہ کی تعمیر میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

اسلام ایک نظریہ حیات ہے جو دین و دنیا کی وحدت، اتصال مادہ و روح، ارتباط معاش و معاد، توافق عقل و وجدان کا قائل ہے۔ اس میں انفرادیت اور اجتماعیت کی حدود متعین ہیں۔ حقوق فرد کے بھی ہیں۔ اور جماعت کے بھی۔ کچھ فرائض اس پر لازم ہیں اور کچھ فروریہ۔ یہی وہ راہ اعتدال ہے، جو موجودہ دور کی نظریاتی عالمی جنگ میں اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ ایک ناقابل تقسیم کل ہے، جس کا نظام اخلاق و معاشرت، طرز حکومت و سیاست اور طریقہ اقتصاد و معاش عبودیت کاملہ اور احساس سپردگی کے گرد گھومتا ہے۔

تعلیم مصدہ ہے۔ اس کا مادہ علم ہے۔ باب تفعیل میں تعدیت کا معنی پایا جاتا ہے۔ گویا کسی تک کوئی بات پہنچانا اور کسی کو آگاہ کرنے کی کوشش تعلیم کہلاتی ہے۔ نظام تعلیم سے مراد وہ اجتماعی کوشش ہے، جس میں اسلاف ارتقائے تہذیب تمدن کے سلسلہ میں اپنے افکار اخلاف کو منتقل کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر نظام تعلیم کی مخصوص نظریہ حیات سے نکون ہوتی ہے۔ نظریہ حیات ہی دراصل کسی تحریک کی نگری اساس مہیا کرتا ہے۔ جو ایک طرف اس قوم کے بنیادی مسائل کا حل اور دوسری طرف تہذیبی، تمدنی اور سیاسی پروگرام ترتیب دینے میں بنیادی محرک بنتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ نظریہ حیات کے بغیر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں نہ تو کوئی ربط قائم رہ سکتا ہے اور نہ ہی عمل و کردار اور سیرت کے لئے مستقل اصول وضع کئے جاسکتے ہیں۔ یا یوں کہ نظام تعلیم مخصوص فلسفہ حیات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کے پس منظر میں مابعد الطبیعیاتی عقائد، بعض فلسفیانہ تصورات زندگی اور کائنات کے بارے بعض عقلی رویے کام کرتے ہیں۔

اور موجودہ دور میں ترقی جتنی ریاستیں یا حکومتیں وجود میں آئی ہیں، کسی نہ کسی فلسفہٴ حیات پر ایمان رکھتی ہیں۔ سیاسی اذکار میں محاذ آرائی ہو یا میدانِ اقتصاد میں جذبہٴ مسابقت، فنی و تکنیکی مہارت کا مظاہرہ ہو یا عسکری قوت میں ایٹم بموں کے تجربات، تجارتی معاملات ہوں یا سیاسی گٹھ جوڑ کے سب سے سب اسی مخصوص فلسفہٴ حیات سے بنیادی طور پر مربوط ہیں۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ نظامِ تعلیم کو اسی مخصوص فلسفہٴ حیات کی خدمت کے لئے نہ وضع کیا جائے۔ کیونکہ نظامِ تعلیم ہی پڑھے لکھے طبقہ میں مخصوص سیاسی، ثقافتی اور تمدنی روایات کی واقفیت ہم پہنچاتا ہے۔ اور زندگی کی جس سطح پر ایک فرد ہے، وہ ان اقدار کے تحفظ اور ان کی ترویج میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔

”اشتراکیت اور سرمایہ داریت کے دو متضاد بگڑے ہوئے کے نظام ہائے تعلیم کو اس ضمن میں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔“

فلسفہٴ اشتراکیت معاشرہ میں اقدار کی اساس معاشی و مادی قرار پاتی ہیں۔ ان اقدار کا خالق ان کے نزدیک خود انسان ہے اور انسان کی غایت مادی اغراض کی تسکین ہے۔ ہر شعبہٴ تعلیم میں اس امر کا خصوصیت سے کاٹ رکھا گیا ہے۔ لادینیت انہی مادی اقدار کی پرستش سے جنم لیتی ہے۔ اس لئے اشتراکی معاشرہ میں لادینیت ایک اساسی مسلحہ کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ اور تعلیم اس روش پر دی جاتی ہے کہ دین و مذہب کی پابندیاں ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہیں۔ اب اشتراکی معاشرہ مکمل طور پر لادینی ہو جاتا ہے۔ ماسکو یونیورسٹی کے سابق صد نیکوس نے نظامِ تعلیم کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اسکول کا ڈھانچہ ایسا ہو جو سماجی شعور کی نشوونما میں ممد ثابت ہو سکے اور مستقبل کے اشتہالی انقلابیوں کو اشتراکیت کی تربیت دے سکے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ افراد کو اشتراکی ضابطہٴ حیات کی حقانیت کا عملی طور پر یقین اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انہیں فوق الفطری مستلمات و توہمات سے دور رکھا جائے۔ عرض یہ کہ تمام مافوق الفطری توانائیوں اور صدقتوں کے بجائے ارضی اور مادی صدقتوں کی تعلیم اشتراکی نظامِ تعلیم کی اہم خصوصیت ہے۔ اس فلسفہٴ حیات کو نصاب میں نمایاں مقام دیا گیا ہے جس کی ایک جھلک آپ مندرجہ ذیل جدول میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

### نصاب الف طبیعیات پانچ سالہ کورس

مضامین	سہ ماہی گھنٹے	کل گھنٹے
تاریخ اشتراکی پارٹی جمہوریہ روس	۱۴	۲۲۴
اشتراکی معیشت	۱۰	۱۶۰
جدیدیتی اور تاریخی مادیت	۱۴	۱۵۸
ریاضیاتی تحلیل	۲۳	۴۱۵
ہندسہ تحلیل	۹	۱۴۸
دیگر اختیاری مضامین		

### نصاب (ب) حیاتیات و کیمیا پانچ سالہ کورس

اس میں مندرجہ بالا تین لازمی مضامین کے علاوہ نامیاتی و غیر نامیاتی کیمیا اور حیاتیاتی کیمیا کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اور سائنس کی تدریس کے لئے اساتذہ کو اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ وہ سائنس کو کام میں لا کر اشتراکی نظمیہ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لیں۔

یہی حال سرمایہ دارانہ نظام میں ہے۔ اس میں "تاریخ کی مادی تعبیر" کا فلسفہ بنیادی محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ سماجی اور معاشرتی اعتبار سے سرمایہ دارانہ نظام کو باقی رکھنے والی تعلیم سماجی طبقات کو باقی رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ معاشی مناسبت سے پیدا ہونے والے مختلف طبقات کا باقی رکھنا اس کے حق میں مفید ہے۔ لہذا اس نظام میں تعلیم کا تصور یہی رہتا ہے کہ وہ ان امتیازات اور طبقات کو باقی رکھنے میں عزم ثابت ہو۔ اس لئے دینیہ و دانستہ تعلیمی مصارف اس قدر زیادہ رکھے جاتے ہیں کہ مزدور طبقہ ہمیشہ ان میں محکوم رہے۔ اور کوئی اعلیٰ ذہانت کا مظاہرہ کر کے تعلیمی وظیفہ حاصل کر بھی لے تو کوشش یہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اساسی سماج سے مکمل طور پر کٹ کر دوسرے سماج میں داخل ہو جائے۔

اس بحث میں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ نظام تعلیم مخصوص نظریہ حیات کے تحفظ کا ضامن ہوتا ہے۔ لہذا ہر نظریہ حیات کا مخصوص نظام تعلیم ہوتا ہے۔ جو اسی کے مطابق ہوتا ہے۔

اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام بذاتِ خود ایک جامع و مانع ضابطہٴ حیات ہے، تو لازمی طور پر نظامِ تعلیم بھی ایسا ہی جامع ہونا چاہئے جو قرآن و سنت کے اساسِ نظریات و تعلیمات کی روشنی میں دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت دے۔

مختلف نظام ہائے تعلیم کے تقابلی مطالعہ میں اسلامی نظامِ تعلیم بالکل جدا گانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ایک مسلمان کی تعلیم و تربیت اس کی ولادت کے آغاز سے شروع ہوجاتی ہے۔ اور پہلی آواز جو اس کے پردہ گوش سے ٹکراتی ہے، وہ آذان کی آواز ہے، جو اللہ کی بندگی اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، نماز کی اہمیت اور اجتماعی فلاح کا جامع پروگرام ہے۔ اسی میں حیاتِ انسانی کی مقصدیت کا اظہار بھی ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے، اس کا ذہن ایک سادہ پلیٹ کی مانند ہوتا ہے۔ جس پر خارجی ماحول سے اٹھنے والی تحریکات کے اثرات مرتسم ہوتے ہیں۔ والدین پر اس کی تکوین و تعمیر سیرت کا انحصار ہے کہ چاہیں تو اسے یہودی بنائیں، چاہیں تو نصرانی۔ اس لئے اسلام نے پہلے ہی سے توحید و رسالت کا نقش اس سادہ لوح پر رقم کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ یہی وہ جوہر ہے، جو ایک مسلمان کی سیرت و کردار کے لئے مستقل بنیادیں مہیا کرتا ہے۔ تو گویا بچے کا پہلا سکول انخوش مادہ ہے والدین کو رزقِ حلال سے بچے کی جسمانی تربیت کی تلقین کی گئی ہے۔ کیونکہ بقول اقبال مرحوم عقل و دانش رزقِ حلال سے پیدا ہوا کرتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو انسانیت کا دورِ طفولیت سمجھیں تو اس عمر میں بچے کی تعلیم جس مرحلہ میں داخل ہوتی ہے وہ اشیاء کے نام سکھانا ہے۔ جس کی طرف غَلَمَ اَدَمَ الْاَسْمَاءَ کَلَّمَا سے اشارہ ملتا ہے۔ اور ثَمَّ عَرَضَهُمْ عَلٰی الْمَلٰٓئِكَةِ سے یوں راہنمائی ہوئی، کہ بچے کے اعضاء میں چیزیں دے کر پوچھا جائے ان کا نام کیلے۔ انسان صرف جسم تو ہے نہیں۔ اس میں عقل بھی ہے اور عوز و فکر کی صلاحیتیں بھی۔ جستجو اور تلاش اس کی فطرت میں ہے۔ وہ جس ماحول میں ہے۔ اور جو کچھ دیکھتا ہے۔ وہ اسے جاننا چاہتا ہے۔ اس کے بغیر اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ یہ ایک فطری طریقہٴ تعلیم ہے کہ بچے اس عمر میں مختلف اشیاء کے نام پوچھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اور اسلام بھی چونکہ دینِ فطرت ہے، اس لئے تعلیم و تربیت کا وہی

نظام مینا کیا جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ یہ ارتقائی فکر کا پہلا زینہ ہے جس میں انسان اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھتا ہے، اس کا سرسری علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

یہ دور تقریباً تین چار سال تک رہتا ہے۔ والدین کو خود بچوں کے سامنے بطور نمونہ کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ بچے کی کردار سازی کو بھی اتنی ہی اہمیت دی ہے۔ پانچ سال کے بچے کے لئے نماز کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ اور اس سے بڑی عمر کا ہو جائے تو سرزنش کو بھی رد رکھا کیونکہ کم سنی میں اعمال صالحہ کی ادائیگی جزو طبیعت بن جاتی ہے۔ اور اسی عمر میں غفلت کی گئی اور بد عملی راہ پائے تو پھر جو انجام ہو گا وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔

خشتِ اول چوں ہند مع رنج

تاثریاتی سے رود دیوار کج

تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچوں کو مکتب میں جو عموماً مساجد سے ملحق ہوا کرتے تھے مصحف شریف ناظرہ یا حفظ پڑھایا جاتا تھا۔ ادب جب بچپن ہی سے انسان اس ہدایت نامہ سے مانوس ہو جاتا ہے تو مستقبل کی زندگی میں اسے اپنا لیتا ہے۔ یوں پانچ چھ سال کی عمر تک ایک مسلمان بچے کا کردار ایک مخصوص معیار میں ڈھلنے لگتا ہے مسجد میں عمر رسیدہ لوگوں سے میل ملاپ اور ہم عمر بچوں سے علیک سلیک معاشرتی شعور اور نظم و ضبط بیز شعوری طور پر فکری و عملی اساس مینا کرتا ہے، جو آگے چل کر مستقبل میں اس کی جماعتی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سن بلوغ پر عقلی صلاحیتیں ارتقائی مراحل بڑی تیزی سے طے کرتی ہیں۔ سابقہ معلومات کی روشنی میں کائنات اور اس مظاہر فطرت کے باسے جلنے کی خواہش (ENQUIRIES) پیدا ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرودی قوتوں کے خلاف جواستدلال مظاہر فطرت اور نظم کائنات سے تھا۔ انسانیت کا دور بلوغت تھا۔ اس علم و عرفان سے عمل و ایمان کی پختگی جنم لیتی ہے۔ پھر قدرت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا۔ یہ عجز و فکر اور استدلال کا دور ہے جو ارتقائی انسانیت میں آیا۔ تہجرت کی بنا ہوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی۔ کَيْفَ تُعْجِبُ الْبُتُوْقِي۔ اے بلدا! تو مردوں کو کیسے

زندہ کرتا ہے۔ قَالَ اَوْلٰٓئِكَ تُوْمِنُوْنَ . کیا تجھے اس پر ایمان نہیں۔ عرض کیا، ایمان تو ہے، لیکن مزید اطمینان قلب کے لئے۔ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ۔ ۴۔ چار پرندوں کے ٹکڑے کیجئے۔ اور مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں پر رکھ دیجئے۔ پھر اپنی طرف بلائیں۔ وہ کیسے بھاگے بھاگے آتے ہیں۔ یہ تجربیت کا مرحلہ ہے۔ علم الیقین، عین الیقین کے بعد کاسب سے اونچا درجہ حق الیقین۔ یہ واقعہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حسی مشاہدہ کے بعد تجربیت اور استدلال کے طریقہ پر اسلام کے تصور کائنات کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ اس کے بعد انبیاء کرام علیہم السلام جن میں حضرت داؤد علیہ السلام شامل ہیں، قافلہ انسانیت کی مدد اور کفالت کے لئے صنعت و حرفت (SCIENCE AND TECHNOLOGY) کی راہ دکھائی۔ قرآن مجید کی آیات اس پر گواہ ہیں۔ یہ ہے دین فطرت کے فطری نظام تعلیم کی ارتقائی گریاں، جس میں معرفت ذات اور معرفت نفس کے بعد اس تعلیم کا آغاز ہوتا ہے جو پیشوں سے متعلق ہے، جس پر معاشرہ کی فلاح و بہبود کا دار و مدار ہے۔

قافلہ انسانیت کی تعلیم و تربیت کا ایک مقصد نظم ریاست ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے دور کے نمائندہ ہیں۔ الغرض خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر علم و حکمت، عقل و دانش اور ریاست و حکومت کے اعتبار سے "انسانیت" اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ یہ اسلام کے فطری نظام تعلیم کا تاریخی پس منظر ہے۔

اسلامی نظام تعلیم کا بنیادی مقصد انسان کو خود شناس بھی بنانا ہے۔ اور خدا شناس بھی عجز و فکر قرآن مجید کی رو سے آیات الہی کا مطالعہ ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا پتہ دیتا ہے۔

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَّآيَةٌ

تَدُلُّ عَلَىٰ اَنَّهُ وَّاحِدٌ

کائنات میں عجز و تدبیر کرنے والوں کے لئے قرآن مجید نے حق تک پہنچنے کی ضمانت دی۔

وَسَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِي اَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَّبِعِنَا لَهْمُ اِنَّهُ الْحَقُّ۔ الآیۃ

ہم ان کو اپنی آفاق و انفس کی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہی



حق ہے۔

لیکن یہ فکر و تدبیر اس شخص کے لئے مفید ہے، جو پہلے سے اللہ رب العزت پر ایمان رکھتا ہو۔ اور مبادیات دین کو مانتا ہو۔ ورنہ عقل و ادراک کی یہ قوت پرواز سے منزل انسانیت اور مقصدیت سے بہت بعید کر دے گی۔ اور بقول اقبالؒ:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے  
مومن کی ہے پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

یہی حال ماہر نفسیات کا۔ اگر پیغام رسل و انبیاء علیہم السلام کو تسلیم کر کے اپنی ذات میں تدبیر کیا جائے تو خود شناسی کی یہ فکری ریاضت خدا شناسی تک پہنچاتی ہے۔ علامہ اقبال نے کتنے عمدہ انداز میں لادین ماہر نفسیات کو خبردار کیا۔

جرات ہے تو افکار کی دنیا سے گذر جا  
ابھی بحر خودی میں ہیں پوشیدہ جزیرے  
کھلتے نہیں قلزم خاموش کے اسرار  
جب تک اسے تو ضرب کلمی سے نہ چیرے

یہی وہ بنیادی تصور ہے، جس کے ہوتے ہوئے طبیعات، نفسیات، ارضیات، نباتیات، حیاتیات، طب و فلکیات جیسے علوم کا مطالعہ جادہ حق اور منزل سعادت تک پہنچا دیتا ہے۔ ایسے انسان کے علم میں بجا طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان علوم کی تحصیل سے بنی نوع انسانیت کی بہتری اور بھلائی کی انتہائی نئی ایجادیں کرتا ہے۔ ورنہ مادی ذہن کے حامل سائنسدان مہلک ترین ہتھیار بنانے اور انسانیتوں کو اجاڑنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

اس بحث سے مقصود یہ ہے کہ اسلام انسان کو انسانیت پہلے سکھانا چاہتا ہے۔ اور پیشہ و تعلیم، اس کے بعد لادینی اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام تعلیم اور اسلامی نظام تعلیم میں یہی فرق ہے۔



اسلامی نظام تعلیم کے پیش نظر انسانی ذہن پر معلومات کا ایک بارگراں ڈالنا نہیں اور نہ اسلامی نظام تعلیم میں اس بات کو اہمیت حاصل ہے کہ کوئی کتنی کتابوں کا حافظ ہے۔ بلکہ اسلام میں ان معلومات و افکار کو معرفت رب العزت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام صرف تعلیم پر بس نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ عملی تربیت کا تقاضہ بھی کرتا ہے۔ علم سے مقصود کردار سازی ہے۔ اخلاقِ حسنہ سے متصف ہونا اور بہترین شہری بننا ایک مسلم طالب علم کا منہمائے نگاہ ہے۔

ان فرض اسلامی نظام تعلیم اسلامی اقدار و روایات کے نفاذ اور ترویج کی عملی تربیت ہتیا کرتا ہے تاکہ مسلمان اپنے اس فرض کی ادائیگی کر سکیں جس کی نشان دہی یوں کی گئی ہے :-

ان مکنہم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف

و نہوا عن المنکر

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ پر خدا کی تعریف سے یہ فرض ہے۔

(۱) نظام عبادات کا قیام۔ (۲) معاشی فلاح و بہبود اور غربت و افلاس کا خاتمہ۔ (۳) دعوت

ارشاد و تلقین اور ہر بُرائی کے خلاف جماد۔

امام غزالی علیہ الرحمہ نے اجماعِ علوم الدین میں علوم شرعی محمود، علوم غیر شرعی محمود، محمود شرعی فرض کفایہ، اور محمود غیر شرعی فرض کفایہ کی تقسیم میں فقہ، حدیث، تفسیر، تصوف وغیرہ کے علاوہ طبیعیات، فلکیات، ارضیات، نباتیات اور حیوانیات کو اسلامی نظام تعلیم میں شامل نصاب قرار دیا۔ کیونکہ حقائق عالم اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔

ریاضی، کیمیا، معاشیات، جغرافیہ، تاریخ، تجارت و صنعت کو فرض کفایہ کے ضمن میں رکھا کیونکہ دین و ملت کی نصرت اور فلاح کے لئے ان کی تدریس ناگزیر ہے۔

کون نہیں جانتا کہ عقائد دینی کو لادینی تحریکوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے جدید فلسفہ

عمرانیات اور منطق کی کتنی اہمیت ہے۔

یہ ان علوم کی فہمست سے جن کو عموماً غیر اسلامی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ہر علم اسلامی ہے۔

اگر اس کی تحصیل ملت اسلامیہ اور عقائد اسلامیہ کے دفاع کے لئے ہو۔ عسکری تربیت بھی اس ضمن میں آتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔

واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترہبون بہ عدو  
اللہ وعدوکم۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ان علوم کی تحصیل ضروری ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی زندگی کو متاثر کر سکتے ہیں تاکہ انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اور اسلامی تصورات حیات کے تحفظ کے لئے قابل فہم حد تک ان سے استفادہ کیا جاسکے۔

اسلامی نظام تعلیم کی خصوصیات کے پیش نظر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:-

- ۱۔ پانچ سال تک کے بچوں کو قرآن مجید ناظرہ پڑھایا جائے۔ عقائد توحید و رسالت، نماز اور معاشرت سے متعلق خصوصی ہدایات دی جائیں اور ان کی پابندی کو دالی جائے۔
- ۲۔ میٹرک کے بعد پیشہ ورانہ تعلیم دی جائے اس پیشہ سے متعلق اسلامی نظریہ کی وضاحت کی جائے۔
- ۳۔ پیشہ ورانہ تعلیم سے قبل ہی اسلامی نظریہ تہذیب و ثقافت اور تاریخ اسلامی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔
- ۴۔ سائنسی علوم کو اس انداز سے پڑھایا جائے کہ اسلام کا تصور کائنات طلبہ کے سامنے ہمیشہ واضح رہے۔

## شخصی ملکیت اور حق ریاست

آج مسلمان بحیثیت مجموعی جن مسائل سے دوچار ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق نظام معیشت (ECONOMIC SYSTEM) سے ہے۔ اس مالی (CAPITALISM) اور اشتراکی (SOCIALISM) نظام ہائے فکر کے اثر و نفوذ سے اسلامی تصورات و مفاہیم میں اختلال نے فکری اضطراب کو جنم دیا۔ اس ضمن میں اسلام کے نظریہ ملکیت، اس کے عناصر ترکیبی اور ریاست کے حق مداخلت کی حدود و قیود کا موضوع بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ اس عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے ہم پہلے ملکیت کے مفہوم و عناصر ترکیبی کی طرف آپ کی توجہ مبذول کریں گے۔ بعد ازاں ملکیت کی اقسام اور آخر میں ریاست کے حق مداخلت کی حدود اور ان قواعد کا تذکرہ کریں گے جو اس حق کی تائید کرتے ہیں۔

ملکیت اور ملک ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔ جسے فقہائے اسلام نے شئی اور مالک کے مابین اس تعلق سے تعبیر کیا ہے جو مالک کو اس شئی مملوک میں تصرف استعمال اور انتفاع کے لئے مختص کر دیتا ہے اور غیر کو اس میں تصرف سے روکتا ہے۔ الا یہ کہ وہ خود کسی کو اجازت دے یا اپنا وکیل و نائب بنائے دوسرے نقطوں میں ملکیت ایک شرعی حکم ہے یا کسی معین شئی یا اس کے منافع پر قدرت حاصل کر لینا ہے۔ اس طرح کہ خود یا نائب کے ذریعے عین سے نفع اٹھا سکتا ہے اور عین یا منفعہ کا معاوضہ دے سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ملکیت کے دو لازمی عنصر ہیں۔ اول، آزادی تصرف، دوم، آزادی انتفاع۔

مؤخر الذکر کی دو صورتیں ہیں۔ ۱۔ استقلال۔ ۲۔ استقلال۔

تصرف سے مراد وہ مادی افعال ہیں، جن کا اثر شئی مملوک پر کبھی اس کی تبدیلی شکل پر ہوتا ہے۔ اور کبھی اس کا وجود ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ اور کبھی دوسرے کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً لکڑی، اس سے دروازے بنا لینا، کپڑے سے قمیص سلوانا۔ یا زمین اور بیج کے ذریعے شئی مملوک کو منتقل کر دینا اور اور خود حق ملکیت سے دستبردار ہو جانا۔

حق استعمال کے معنی ہیں مملوک شئی کو باقی رکھتے ہوئے اس سے منافع کا حصول مثلاً جانور سواری کے لئے مکان رہائش کے لئے، زمین زراعت کے لئے۔

حق استغلال سے مراد شئی مملوک سے محنت و عمل کے ذریعے حاصل ہونے والے منافع اور نتائج کو بالعوض دینا۔ مثلاً زمین کے درخت، اجرت وغیرہ۔

ملکیت دو انواع ہیں۔ ۱۔ ملکیت عامہ، ۲۔ ملکیت خاصہ (شخصی ملکیت)

موسخر الذکر میں حق تصرف کسی خاص فرد کو حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ شئی مملوک میں تصرف اور نفع اٹھانے میں مختار ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ملکیت کے جملہ عناصر ترکیبی (تصرف و انتفاع) میں ایک شخص شئی مملوک پر قادر ہوتا ہے۔ اور اپنی اصل کے اعتبار سے وہ بغیر کسی ردک ٹوک کے اپنی مشیت اور ارادے سے جیسے چاہے، اسے استعمال میں لاسکتا ہے، نفع اٹھا سکتا ہے، فنا کر سکتا ہے۔ اور دوسرے کو بالعوض یا بغیر عوض منتقل کر سکتا ہے۔

ملکیت عامہ اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ اپنی وضع اور اصل کے لحاظ سے اس کا محل مجموع افراد امت کا حق ہے۔ لہذا امت کی مجموعی کفالت اور حاجت کے پیش نظر اس سے شئی مملوک کو تصرف استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ بغیر اس کے کسی فرد سے لازمی متحدہ لیا جائے۔ لہذا اس میں کسی شخص کو اختیار نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی اور منشا سے اسے تصرف میں لائے۔ بلکہ اس شئی پر مکمل حق ریاست کا ہونا ہے۔ بایں معنی کہ کسی فرد کے لئے اس میں تصرف کی اجازت نہیں جب تک قوانین ریاست اس کی اجازت دے۔ اس سیاق میں "مداخلت" سے مراد تصرف، انتفاع، استعمال و استغلال پر پابندیاں لگانے کا اختیار ہے۔ ۱۔ منفی، ۲۔ مثبت۔

اول الذکر نوعیت کی پابندیاں دائرہ اختیار کو محدود کرتی ہیں۔ اور مؤخر الذکر کی قبود بعض وجوہ میں اس حق کے استعمال پر جبراً پابندی کرائی جاتی ہے۔ مثلاً حکومت کسی سرمایہ دار کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے سرمایہ سے ٹیکسٹائل انڈسٹری لگائے۔ اگرچہ ملکیت خاصہ کے تصور کے مطابق اسے حق حاصل ہے کہ وہ سرمایہ کاری کے لئے کوئی بھی میدان اپنے لئے منتخب کرے۔ گویا اس مثال میں حکومت کا کسی خاص میدان میں سرمایہ کاری پر مجبور کرنا مثبت پابندی ہے۔ اس میں حق تصرف جو ملکیت خاصہ سے پیدا ہوتا ہے، وہ سلب نہیں ہوتا۔ ان پہلی قسم میں جہاں بعض وجوہ میں حق تصرف و انتفاع کے استعمال سے روک لیا جاتا ہے۔ اس میں حق ملکیت سلب ہو جاتا ہے۔

اس اجمالی تعارف کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور اسلام کے نظریہ ملکیت کے جزائی ترکیبی کا جائزہ لیتے ہیں۔ نصوص شرعیہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بے غبار ہو جاتی ہے کہ اسلام کا نظریہ ملکیت اس سے اپنی طبع کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے جو ہمیں کیپٹلزم (CAPITALISM) اور سوشلزم (SOCIALISM) میں ملتا ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں اصل ملکیت، ملکیت خاصہ ہے جس کے معنی ہیں کہ ہر شخص کو بلا قبود و محدود شئی مملوک میں تصرف، انفاق اور استعمال کی پوری آزادی ہے۔ اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص جس کا وہ مالک ہے، تجارت و صنعت میں اور دیگر معاملات میں بیع و شراء، ہمدردی و عزیزہ میں جیسا تصرف چاہے کر سکتا ہے، اور اپنی مرضی سے جو چیز جس مقدار میں چاہے پیداوار حاصل کرنے کا مجاز ہے۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ دارانہ نظام اقتصاد میں آمد و خرچ کی جملہ مدت میں انسان کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہاں اس دور میں اگر سرمایہ دارانہ نظام کی حامی حکومتیں اگر اپنے شہریوں کے کسب اور انفاق پر پابندی عائد کرتی ہیں تو وہ خلاف اصل ہے۔ لہذا ان پابندیوں کو محض استثنائی صورتیں شمار کرنا چاہئے۔

اشتراکی نظریہ ملکیت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس کی اساس ملکیت عامہ ہے، جس کی نمائندگی ریاست کرتی ہے۔ جملہ وسائل آمدن پر اسی کا تسلط ہوتا ہے۔ اور تمام تر تصرفات، آلات پیداوار مختلف منصوبوں (PROJECTS) کی واحد مالک ریاست ہے۔ کیونکہ اصل محل ملکیت جماعت و ریاست ہے۔

کا حق ہے۔ لیکن فرد کا وجود جماعت سے علیحدہ ممکن نہیں۔ وہ بحیثیت ایک عضو جماعت کے اشتراک کی بنیاد پر حق ملکیت سے مستفید ہو سکتا ہے۔ لہذا اس حد تک اس کا حق صرف اس صورت میں قابل استعمال ہو سکتا ہے جب کہ جماعت اس کی اجازت دیتی ہے اور اس کے حق کو تسلیم کرتی ہے۔ اور یہ اس لئے بھی ہے کہ زمین اور سرمایہ اصلاً ریاست کا حق ہے۔ یہ مجموعی طور پر تمام افراد کے مصالح کے تحفظ کے لئے ہے اور ریاست افراد کو عمل کے مطابق انہیں اجرت ادا کرتی ہے۔ گویا یہ اجرتیں افراد کے اعمال (LABOUR) کا معاوضہ ہیں۔ اس نظریہ سے شخصی ملکیت کے تصور کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ اور افراد پر اشیاء صرف کی تقسیم صرف اور صرف ریاست کی مرضی پر ہے۔ ریاست ہی جماعت کی مجموعی جماعت کی نسبت سے قوت پیداوار کے اضافے کے لئے طریقہ کار کا تعین کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر فی زمانہ اشتراکی ریاستیں بعض شخصی حقوق کا اعتراف کرتی ہیں تو وہ اصل کے خلاف ایک استثنائی صورت ہے۔ اسلام اس لحاظ سے دونوں مذکورہ نظامہائے فکر سے مختلف ہے۔ جہاں اسلام نے شخصی ملکیت کو تسلیم کیا ہے وہاں جماعتی ملکیت کا تصور بھی موجود ہے۔ بعض نصوص قرآنیہ اور احادیث میں مال کی نسبت افراد کی طرف کی اور فرمایا۔

” وَتَأْكُلُونَ الثُّمَارَ أَكْلًا لَمَّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبَّ جَنَّا۔“

” وَلَا تَوْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا۔“

اموال کی حفاظت پر زور دیتے ہوئے اللہ کے رسول نے فرمایا۔

ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام۔ کحرمة یومکم

ہذا فی شہرکم هذا فی بلدکم هذا۔

کل المسلم علی المسلم حرام عرضہ و مالہ و دمه۔

مال کی حرمت پر نص فرمائی ہے۔

” وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتَدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لَأَنتُمْ أَكْلُوا مِمَّا قُرْبًا۔“

من اموال الناس بالاثم و انتم تعلمون۔

اور مال کے بچاؤ کے لئے سرقہ کو جرم قابل سزا قرار دیا۔

السادق والسارقة فاقطعوا ايديهما جزاء بما كسبا نكالا من الله

والله عزيز حكيم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق اموال پر ہر قسم کی تعدی اور ظلم کو مذموم اور موجب عذاب کہا۔

”من ظلم قيدا وثبرا من الارض طوق من سبع ارضين“

”من اقطع حق امرئ مسلم بيمينه فقد اوجد الله له السارو

حرم عليه الجنة“

یہ اور اس معنی میں بہت سی آیات و احادیث وارد ہیں جن سے اسلام میں شخصی ملکیت کے ثبوت حق پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف بہت سے ایسے ادارے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے ملکیت عامہ (قومی ملکیت) کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً مسجدیں، اوقاف، اراضی حمی، اموال فیی، سوار عراق کی زمین۔ اور بعض اشیاء کی ملکیت میں جملہ انسانوں کا اشتراک ہے۔ جیسے رسول اللہ نے فرمایا۔

الناس شرکاء فی ثلاث فی الماء، والکلاء والنار۔

آیت: ”وخلقکم مما فی الارض جمیعاً“ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ زمین اور اس کے باطن میں جو کچھ ہے، جملہ انسانیت کے انتفاع کا محل ہے۔ اس لئے کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے، اس کی اضافت تمام افراد بشریت کی طرف ہے۔ یہی تصور ”نظریہ استخلاف کی بنیاد بنتا ہے، یا اس معنی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ مالک حقیقی ہے جس کی دلیل اللہ کا کلام ہے۔

واتوهم من مال الله الذي انا کم۔

وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ۔

بظاہر ان نصوص سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام ہر دو نوع ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ گو ہر نوع کی حدود متعین ہیں۔ علامہ اسلام اس مسئلہ میں ”نظریہ استخلاف“ اور ”ملکیت مزدوجہ“ (دوسری ملکیت) کے قائل ہیں۔

عہد رسالت میں اور اس کے بعد عہد صحابہ میں اموال کی اس لحاظ سے تین انواع تھیں۔

۱۔ وہ اموال جو خالصہ ریاست کی ملکیت میں ہیں اور ان میں فرد کا کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ وہ اموال جو خالصہ شخصی ملکیت میں ہیں اور ریاست کا اس میں حق نہیں۔

۳۔ وہ اموال جو ابتداءً ریاست کی ملکیت میں ہیں لیکن انتہاء قبضہ یا کسی اور وجہ مشروع سے شخصی ملکیت میں بدل جاتے ہیں۔

حضرت امام شافعی نے "کتاب الام" میں ان اقسام کا تذکرہ کیا ہے۔

"نظریۃ اسخلاف" کا مقصد یہ ہے کہ عمومی حیثیت سے مال کی حقیقی نسبت اللہ سبحانہ و تعالیٰ

کی طرف ہے اور مجازاً مجموع افراد کی طرف۔ باہم معنی کہ تمام افراد خلیفہ کی حیثیت سے وظیفہ ملکیت

ادا کرتے ہیں۔ باقی با اموال کا بعض افراد کے ساتھ اختصاص، تو وہ نزاع اور ممکن اختلافات سے بچنے

کے لئے ہے۔ ورنہ اموال میں تصرف کی تمام تر انواع کا مقصد اجتماعی مصالح کی رعایت ملک اور دینی

اقدار کا تحفظ ہے۔ اس لحاظ سے فرد کا کوئی ایسا حق ملک نہیں ہے جس میں اجتماعی حق کا کسی کسی شکل

داخل نہ ہو۔ اس پس منظر میں شخصی ملکیت میں مداخلت کا حق ریاست کو حاصل ہے۔ یہاں تک بعض علماء

کا خیال ہے کہ حاجاتِ اصلیت کے بعد بیع جانے والا مال، اگرچہ وہ جائز طریقے سے کمایا گیا ہو، اس میں بھی

امت کا حق ہے اور حکومت نائب کی حیثیت سے اس میں مداخلت کر سکتی ہے۔ اس حق مداخلت کے

معنی نہیں کہ حکومت اس بہانے لوٹ کھسوٹ اور ظلم کو روا رکھے۔ بلکہ اس حق کے استعمال کی قیود و حدود ہیں۔

اب ان فقہی قواعد اور مہادی کا جائزہ لیتے ہیں، جو ریاست کے حق مداخلت کی تائید حکمت مقاصد

اور حدود کا تعین کرتے ہیں۔

۱۔ ضرر کو بقدر امکان دور کیا جائے۔

۲۔ ضرر شدید کو ضرر خفیف سے دور کیا جائے۔

۳۔ ضرر عام کو رفع کرنے کے لئے ضرر خاص کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ مفاسد کو روکنا مصالح کے حصول پر مقدم ہے۔



۵۔ ہر عمل مباح جس سے دوسرے فرد یا مجموعی معاشرہ کو ضرر پہنچتا ہے، ممنوع ہے۔  
اسلام کے نظم معیشت کی بنیاد ہے ایسی ریاست کا قیام جو انسان کی مجموعی فلاح اور مصلح عامہ کی ذمہ داری قبول کرے۔ جنہیں اصطلاح میں مقاصد شریعہ کہا جاتا ہے۔ یعنی پانچ چیزوں کا تحفظ، دین، نفس، عزت، عقل اور مال۔ ہر وہ عمل جس سے ان پانچ میں کسی پر زد پڑتی ہے وہ وجہ فساد ہے اور اس کا دفع کرنا مصلحت ہے۔

اسی ضمن میں یہ ضابطہ بھی پیش نظر ہے کہ جملہ حاجات اور اجتماعی ضروریات کی تکمیل اور ہم رسانی کے لئے ہر شعبہ، مثلاً تجارت، صنعت کے لئے، ہر ٹیکنالوجی، تدریس، دفاع وغیرہ کے لئے مہارت اور کام فرض کفایہ ہے تاکہ امت مجموعی طور پر بنیادی ضروریات کے سلسلہ میں کسی کی محتاج نہ ہو۔

دوسرا اہم اصول متوازن نظام اقتصاد اور اجتماعی عدل کا قیام ہے جسے قرآن مجید نے :-

”کی لا یكون دولة بین الاغنیاء منکم“

سے تعبیر کیا ہے۔ اور نزول قرآن کی حکمت بیان فرمائی گئی۔

• وانزل معہم الكتاب والمیزان ليقوم الناس بالقسط۔

تیسرا اصول جو نظام زکوٰۃ اور اس کے مصارف سے واضح ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ فرضیت زکوٰۃ کا ہدف اجتماعی کفالت ہے۔ یعنی کہ اس سے مقصود ایسا نظام ہے، جس میں کوئی شہری ایسا نہ رہے جو بنیاد کا ضروریات (کھانا، لباس، مکان) سے محروم ہو۔

مذکورہ بالا قواعد اور مقاصد شریعہ کے تناظر میں جب برطی ہے کہ اصل ملکیت اللہ رب العزت کی ہے تو انسان محض ایک امین متصرف کی حیثیت رکھتا ہے اور تصرف میں اس حد تک کہ شرع اُسے اجازت دیتی ہے۔ لہذا غیر مشروع ذرائع سے حصول مال پر حق ملکیت ثابت نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے نفعوں میں ملکیت ایک حق ہے، جس کا ثبوت اثبات شرع پر ہے۔ اور اس سے قبل جملہ اشیاء ملکیت عامہ میں ہیں۔ حصول ملکیت کے مشروع وسائل میں وراثت، وصیت، ہبہ، حیازہ (POSSESSION) یعنی غیر ملوکہ فردیہ کو آباد کرنا یا قبضہ میں لینا ہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے زمین پر شخصی حق ملکیت صرف اس کی سطح

تک ہے جس میں عادیہ زراعت و تعمیر کام ہو سکتا ہے۔ زمین کی تہہ میں جملہ سوائل اور معدنیات کا حکم پانی کا حکم ہے۔ یعنی اس میں شخصی حق ملکیت محض اس وجہ سے نہیں کہ فرد اس سطح زمین کا مالک ہے۔ گویا زمین کی تہوں میں بہاؤ خزانہ جماعت ریاست کی ملکیت ہے۔ وگذا اور اس کے احکام سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کی ملکیت کا محل اموال فنی، ارض موت، جنگلات، نہریں، اموال متروکہ وغیرہ ہیں۔

جیسے پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ شخصی مالک کے اندر بھی ریاست کا حق کسی کبھی شکل میں باقی رہتا ہے خواہ وہ مال مشروع طریقے سے حاصل کیا گیا ہے اور اس میں سے واجبات (زکوٰۃ و عشر وغیرہ) کی ادائیگی کر دی گئی ہو۔ "وفی اموالہم حق للسائل والمحروم"۔ اسی اصل پر امرت کی مجموعی کفالت اور دفاع کیلئے زکوٰۃ کے علاوہ بھی ٹیکس لگانے جاسکتے ہیں۔

مذکورہ قواعد و ضوابط اور کلیات کی روشنی میں ریاست کو شخصی ملکیت میں جو حق مداخلت حاصل ہے، اس کی مختلف شکلیں ہیں جن میں سے بعض کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

حاکم وقت کو یہ حق حاصل ہے کہ دشمن کے حملہ کے وقت اور آفات سماوی سے واقع خطرات کے مقابلہ کے لئے مہتمول افراد پر مالی ذمہ داریاں عائد کرے۔

ایسا اقتصادی ڈھانچہ وضع کیا جائے، جس سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے، کیونکہ اگر کاز دولت کئی سماجی اور معاشی مفاسد کو جنم دیتا ہے۔ اس کا طریقہ ایک معتمد ہے اور اسے دور کرنے میں مصلحت ہے۔ وہ افراد جو دولت کو بے جا صرف کرتے ہیں اور بیع و شراہ کا شعور نہیں رکھتے ان پر پابندی لگائی جائے۔ لیکن تصرف کا حق رُشد اور عقل و شعور کے ساتھ مقید ہے۔

اُمراء کو اپنے عزیز رشتہ داروں کی کفالت پر مجبور کیا جائے۔ کیونکہ ان سے مال لینا یہ کم نقصان ہے ان عزاہ کے بھوک و افلاس سے مر جانے کے مقابلہ میں۔ اس لئے ایسی حالت میں ضرر خفیف کو اس عظیم نقصان کے مقابلہ میں برداشت کیا جاسکتا ہے۔

ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کے مال پر پابندی اور غیر منصفانہ قیمتوں پر پابندی اس قاعدہ کے تحت

جائز ہے کہ ذخیرہ اندوزی اور بلا روک ٹوک قیمتوں میں اضافے موجب فساد و اختلال ہیں اور فساد کاروکن مقصودِ شرع ہے۔

اگر کوئی شخص ایسے کاروبار کا آغاز کرتا ہے جس سے اس کے پڑوسیوں کو نقصان ہوتا ہے تو اس جگہ ایسے کاروبار پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ مثلاً رانٹشی مکانات کے ساتھ کوئی شخص بھیڑ یا ایسا کارخانہ لگاتا ہے، جس کی بو اور کیمیکل اور فاضل مواد سے آس پاس کے لوگوں کو ایذا رسانی کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے کہ اپنے حق ملکیت کا استعمال ایسی صورت میں جائز نہیں جس سے دوسرے کو ایذا پہنچے۔

جو شخص اپنے املاک کو معطل کر دیتا ہے بایں معنی کہ اسے مزید پیداوار کے لئے نہیں لگاتا۔ مثلاً زمین آباد نہیں کرتا تو حکومت کو حق حاصل ہے کہ وہ اراضی اس سے چھین لے اور اس کی آباد کاری کا اہتمام کرے۔ یہ اس لئے ہے کہ اس کا تعطل مجموع امت کو فقر کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ اس لئے یہ ایک وجہ فساد ہے۔ لہذا اس کو حق ملکیت سے محروم کر دینا مصلحت ہے حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لیس حق بعد ثلاث سنین"۔ یوں شریعت اسلامہ مالک کو سرمایہ کاری پر مجبور کر سکتی ہے۔ کیونکہ اصل مال تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ہے اور اس مال کا وجود مجموع امت کی ضروریات پورا کرتا ہے۔ وہ ایک امین کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر اصحابِ موال سرمایہ کاری کے لئے جدید وسائل اور ذرائع استعمال نہیں کرتے تو حکومت کو حق حاصل ہے کہ وہ انہیں زراعت و صنعت میں جدید اور مفید مشینری کے استعمال پر مجبور کرے، کیونکہ اجتماعی کفالت جو واجب ہے، اس کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتی ہے اور جب واجب اس کے بغیر ممکن نہیں تو جدید مشینری کا استعمال بھی واجب قرار دیا۔ اور واجب کی ادائیگی پر حکومت افراد کو پابند بنانے کا حق رکھتی ہے۔

اگر لوگ کسی خاص ٹیکنالوجی یا پیشہ ورانہ مہارت اور انڈسٹری لگانے سے رک جائیں حالانکہ ہر فرد کو کفایہ میں سے ہے، تو حکومت کو حق حاصل ہے کہ اصحابِ موال کو اس خاص میدان میں

مہربانہ کاری پر مجبور کرے۔

اسی طرح غیر معیاری مصنوعات، ملاوٹ اور فراڈ کی صورت میں ضبطی کے احکام نافذ کئے جاسکتے ہیں۔

غرضیکہ ریاست کا حق شخصی ملکیت کے تینوں عناصر یعنی استعمال، تصرف اور انتفاع سے وابستہ ہے اور مقاصد شرعیہ کی نسبت سے ان میں حق مداخلت حاصل ہے۔

# اسلامی نظام حکومت

اور  
خلفاء راشدین  
(ابوبکر و عشر)

آج انسانیت جن مسائل سے دوچار ہے اور عصر حاضر کا انسان جس شے کا متلاشی ہے، وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوتے پیغام کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اخلاق و معاشرت، قانون و عدالت، مساوات، مروت اور سیاست و حکومت کی اصلاح اور وحدت انسانیت کے لئے جو محکم ترین اساس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے عملی طور پر مہیا فرمائی، وہ سبھی دنیا تک کے لئے قابل تقلید نمونہ ہیں۔

## ابوبکر صدیق <sup>رضی اللہ عنہ</sup> اور نظام حکومت

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سنت کو ہر حال میں مقدم رکھا۔ بھونے سے بھی وہ کام نہ کرتے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند کرتے تھے۔ اور ہر اس کام کے کرنے میں سعادت سمجھتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔

ولیم میور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں رطب اللسان ہے۔

”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قلب و ذہن میں شخصی شان و شوکت کا خیال تک

نہ تھا۔ حالانکہ وہ شانہ اختیارات کے مالک تھے۔“

انہوں نے اپنی ساری طاقت صرف اسلام کی خدمت اور اس کی ترقی برتری میں صرف کی تاکہ

ملتِ اسلامیہ کا فائدہ ہو۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ایمان و ایقان تھا۔ آپ نے عوام سے ہمیشہ کہا۔

”مجھے اللہ کا خلیفہ کہہ کر نہ پکارو، میں رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔“

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی بجا آوری کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے مستعد رہتے۔ جب آپ سرریارائے خلافت ہوئے تو مشکلات کا ایک طوفان تھا۔ جو اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مزید برآں فتنہ ارتداد، منکرین زکوٰۃ کی شورشیں اور مدعیان نبوت کی سازشیں، ایک سے ایک بڑھ کر خطرہ تھا۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس دانش مندی، جرات اور استقلال سے ان کو فرو کیا، اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت یہ حسن اور یہ نکھار، یہ جرات اور یہ دانش مندی عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا نتیجہ ہیں۔ نکاح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں یارِ غار حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اہمیت کا اندازہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ہوتا ہے۔

”مجھ پر ابو بکر سے بڑھ کر کسی کے احسان نہیں۔ میں نے ہر ایک کا بدلہ پکا دیا ہے۔“

لیکن ابو بکر کا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔“

شاعر اسلام علامہ اقبال، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یوں تعارف کرتے ہیں۔

آن امن الناس بر مولائے ما      آن کلیم اول سینائے ما

ہمتِ او کشت ملتِ را چوں ابر      ثانی اسلام، غار و قبر بدر

آپ کی زندگی کا اہم ترین پہلو حضور سرور کائنات سے وابستگی اور جذبہ قربانی ہے۔ عنانِ خلافت سنبھالتے ہی پہلا مسئلہ جو سامنے آیا وہ حضرت اُسامہ کی لشکر کشی تھی، جسے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تیار کیا تھا۔ اس موقع پر کبار صحابہ علیہم السلام بھی گھبرا اٹھے۔ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عزمِ عالی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر مجھ کو یہ بھی گمان  
ہوتا کہ درندے مجھے اٹھالے جائیں گے، تو بھی تمہیں رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اُسامہؓ کا  
شکر ضرور بھیجتا۔ اگر بستیوں میں سوائے میرے ایک متنفس بھی باقی نہ رہتا تو بھی روانگی کا حکم  
یقیناً دیتا۔

منکرین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کے بارے میں بڑے بڑے صحابہ کرام متردد تھے۔ لیکن حضرت ابو بکر  
صدیق رضی اللہ عنہ اسلام کے اس عظیم ترین رکن کے تحفظ کے لئے منکرین زکوٰۃ سے برد آزما ہونے کیلئے  
اپنے موقف پر ڈٹ گئے۔ بالآخر تمام صحابہ کرام نے اس فیصلہ پر صاد کہا۔ اور خلیفۃ الرسول کی دانشمندی  
اور دوراندیشی کو سراہا۔

آپ نے جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا، وہ اسلامی ریاست، خلیفہ کے اختیارات و فرائض اور رعایا کی  
شہری آزادیوں کا واضح چارٹر ہے۔ یہ محض الفاظ نہیں تھے۔ بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان  
پر صحیح صحیح عمل کر کے دکھایا۔ فرمایا۔

”بعد حمدِ الہی، اے لوگو! واللہ، مجھے ہرگز امیر بننے کی حرص نہ کبھی دن کو تھی نہ رات  
میں۔ اور نہ میرا میلان اس کی جانب تھا۔ اور اپنے اللہ سے پوشیدہ یا ظاہر اس کے لئے نہ تمنا  
کی۔ البتہ مجھ کو یہ خوف ہوا کہ کوئی فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ مجھے حکومت میں راحت بالکل نہیں۔  
بلکہ مجھے ایک ایسے امر عظیم کی تکلیف دی گئی ہے جس کے برداشت کی مجھے طاقت نہیں۔ اور نہ وہ  
بغیر اللہ عزوجل کی مدد کے قابو میں آسکتا ہے۔ میری ضروریہ آرزو تھی کہ آج میری جگہ سب سے  
زیادہ قوی آدمی ہوتا۔

بے شک میں تمہارا امیر بنایا گیا۔ اور میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں راہ راست پر چلوں  
تو مدد دو۔ اور اگر بے راہ چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ صدق امانت ہے۔ اور کذب خیانت  
جو تم میں کمزور ہے، میرے لئے قوی ہے۔ انشاء اللہ اس کا حق دلو آؤں گا۔ اور تم میں جو قوی  
ہے، وہ میرے نزدیک کمزور ہے۔ اس سے انشاء اللہ حق سے کر چھوڑوں گا۔

جو قوم راہِ حق میں جہاد چھوڑ دیتی ہے، وہ ذلیل کر دی جاتی ہے۔ اور جس قوم میں بے حیائی کا رواج ہو جاتا ہے، اس پر عام طور پر عذاب الہی نازل ہوتا ہے۔

جب تک میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کروں، میری اطاعت کرو۔ اور میں جب خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کروں، تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔“

یہ ایک حقیقتِ واقعہ ہے کہ معاشرہ کے امن و امان، معاشرتی انصاف اور عدالت اجتماعی کا سرچشمہ برسرِ اقتدار طبقہ کا کردار ہوتا ہے۔ جب وہ ایسے حقوق اور مراعات اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے، جو دوسروں کو حاصل نہیں ہوتے، اپنے لئے الگ قانون وضع کرتا ہے۔ اور عزیب رعایا کے لئے کچھ اور۔ پھر دوسروں سے فائق اور برتر ہونے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ تو وہ خود کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ ایسے حالات میں ان کے فیصلے عموماً غلط ہوتے ہیں۔ اوریوں پوری سوسائٹی ان مضرآت کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ خطبہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مبنی دینی ریاست کے خدو و خال کی بھرپور وضاحت کرتا ہے۔ آپ کے اسی حکیمانہ طرزِ عمل اور دانش مندانہ پالیسی نے سیاسی وحدت کو استحکام بخشا۔ ہر شخص یہ سمجھ کر کہ اسے ملک و حکومت میں مساوی حقوق حاصل ہیں، بدل و جان حکومت کی اطاعت پر مشغول ہو گیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب امار و خلفاء کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوں۔ شکایت اور تنقید کا حق حاصل ہو تو انتشار کا روگ پیدا نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے واضح طور پر اعلان فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود میں رہتے ہوئے مسلمانوں کی قیادت اور امور سلطنت کی انجام دہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں۔

آپ نے کبھی اپنے آپ کو ان قوانین سے مستثنیٰ نہ سمجھا، جو عام لوگوں پر لاگو تھے۔ ان کے نزدیک نظامِ مصطفویٰ کا نفاذ ایک امانت تھی۔ اور فرمایا کرتے:۔

”جس شخص کے سپرد قوم کی امانت کی جائے، اور وہ اس میں خیانت کرے اس کا کچھ حق“



ذاتی مصرف میں لے آئے، وہ کسی اور پر نہیں، بلکہ خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ اور قیامت کے دن اسے اس خیانت کی دردناک سزا ملے گی۔“

خود حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ آخری وقت اپنے رشتہ داروں کو بلا کر ہدایت کی ”میں نے دورانِ خلافت بیت المال سے جو رقم لی تھی، اسے واپس کر دیا جائے۔ اور اس عرض سے میری فلاں زمین بیچ کر اس سے حاصل شدہ رقم بیت المال میں جمع کر وادی جائے“ تعمیل وصیت پر وہ رقم بیت المال میں جمع کرائی گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔  
” اللہ ابو بکر پر رحم فرمائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد کسی بھی شخص کو ان پر اعتراض کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آئے۔“

## حضرت عیسیٰؑ اور نظام حکومت

اسلام کی انقلابی دعوت نے جہاں انسانی رویوں اور طرزِ عمل کو ایک نیا رخ بخشا، وہاں اجتماعی فلاحی و بہبود کے لئے اور بنی نوع انسان کے وسیع تر مفادات کے لئے ایک عالمگیر فلاحی ریاست کا تصور پیش کیا۔ تدبیرِ مدُن اور سیاست کے وہ راہنما اصول متعین کئے، جن کی افادیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ موجودہ دور کا انسان کس قدر پریشاں فکر ہے۔ اس کا اندازہ ہر وہ چشم بصیرت باسانی کر سکتی ہے، جو احوالِ واقعی کے آئینہ میں عالم امکان کا جائزہ لے رہی ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے جمہوریت کی بحالی اور مساوات کی صدائے احتجاج اس حقیقت کی بلا تردید غمازی کرتی ہے کہ من حیث النکل پوری دنیا ظلم و استبداد کے آہنی شکنجوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ایسا ہونا بھی غیر متوقع نہیں۔ کیونکہ خانہ ساز شریعتِ ظالم کو چہرہ دستیوں کا قانونی جواز مہیا کرتی ہے۔ اس کی صدائے بازگشت کم و بیش ہر ملک سے آ رہی ہے۔  
یہ فخر صرف اور صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰؑ فرزندِ پیدا کئے، جنہوں نے عدل و انصاف بلا تمیز رنگ و نسل قانونی مساوات، آزادی رائے اور جمہوری اقدار کے فروغ میں ایسا نمونہ پیش کیا جو تا ابد انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے کوشاں ہر تحریک کے لئے مینارۃ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔

حسنت عمر رضی اللہ عنہ ہر معاملہ میں خود کو بارگاہ ایزدی میں جوابدہ سمجھتے تھے۔ خوفِ خدا کا یہ عالم ہوا کرتا تھا کہ کثرتِ گریہ سے آنکھوں پر سیاہ حلقے پڑ گئے۔ یوں جب بارِ خلافت بھی کندھوں پر آ گیا تو اس گریہ میں اور بھی اضافہ ہو گیا، جب بھی خلافت کی گرانبار ذمہ داریوں اور یومِ مکافاتِ عمل کا احساس ہوتا تو فرماتے،

”اے عمر بن الخطاب! امیر المؤمنین، خدا سے ڈرو۔ ورنہ وہ تجھے عذاب میں مبتلا

کر دے گا۔“

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ایک تنکا اٹھا رہے ہیں اور کہے جا رہے ہیں۔

”کاش کہ میں ایک تنکا ہی ہوتا۔ کاش میری ماں نے مجھے نہ بنا ہوتا۔“

ان جیسا بہادر اور جرات مند بھی خلافت کے بارگراں سے یوں ترساں دلہذاں ہے۔ کیونکہ یہ منصب کوئی پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ احکامِ الہیہ کی تنفیذ، انسانی حقوق کے تحفظ، قیامِ عدل و انصاف اور قوم کی اجتماعی کفالت ہے۔ آپ نے ان عظیم ترین ذمہ داریوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی اولاد کو اقتدار و حکومت سے منع کیا۔ اور فرمایا کہ۔

”خطاب کی اولاد میں سے جو بوجھ میں نے اٹھایا ہے وہی کافی ہے۔“

آپ نے اپنے عمل سے یہ واضح کر کے دکھایا کہ خلافتِ ارضی سے مراد وہ نمائندہ حکومت ہے، جو افرادِ معاشرہ کو حدودِ الہی کا پابند بناتی ہے۔ بلا تفریق ہر فرد کو ضروریاتِ زندگی مہیا کرتی ہے۔ اور ہر فرد کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے فرائض کا کھلے بندوں اظہار کیا اور فرمایا۔

”اگر کوئی پیاسا کتابھی مر جائے تو اس کی مجھ سے باز پرس ہوگی۔“

اس لئے آپ شکایت کا دروازہ عوام پر بند نہیں فرماتے تھے۔ خود کو تنقید کے لئے ہر وقت پیش کرتے ایک موقع پر آپ نے مہر کی مقدار کم مقرر کرنے کا حکم دیا تو ایک خاتون نے بھری محفل میں ٹوکا اور

قرآن مجید سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ ہر میں "قنطار" دینے کی صراحت ہے اور ظاہر ہے، اس لیے مراد ایک خطیر رقم ہے۔ آپ نے اعتراف کیا اور فرمایا:-  
"عورت نے پچ کما اور عسمر نے خطا کی۔"

خلافت کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے لئے آپ ہر مسئلہ پر مسلمانوں سے مشورہ لیتے۔ کبار صحابہ کی مجلس مشاورت کے علاوہ عامۃ المسلمین سے بھی رائے طلب کرتے۔ عراق و شام کے مفتوح علاقوں کے سلسلہ میں آپ نے فرمایا:-

"میں تمہیں اس لئے جمع کرتا ہوں کہ تم انتظامی معاملات کی اس امانت میں میسرے

شریک بنو۔"

ایک مرتبہ یوں کہا:-

"مشاورت کے بغیر خلافت کی کوئی حقیقت نہیں۔"

عوام کی رائے کا بیجا احترام کرتے، حتیٰ کہ عمال کے انتخاب میں عوام کی ضماندیہ پہلے معلوم کرتے اور انکی عدم رضا پر عمال کو معزول بھی کر دیتے۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ ملکی معاملات کا انحصار اس بات پر ہے کہ عوام کو اپنے حکمرانوں پر مکمل اعتماد ہو۔ عدم اعتماد اور تذبذب کی صورت منافرت کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ اور منافرت کا انجام بدامنی اور لاقانونیت ہوا کرتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچ فرمایا:-

"تمہارے وہ حاکم خوب ہیں جن کو تم پسند کرتے ہو اور وہ تمہیں پسند کرتے ہوں۔ اور بدترین

ہیں وہ حاکم، جن سے تم بغض رکھتے ہو اور جو تمہیں غضب آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمال پر کڑی نگرانی فرماتے۔ انتہائی سادہ زندگی گزارنے کی تاکید فرماتے اور عوام سے حسن سلوک کا حکم دیتے۔ آپ کا اصول تھا کہ:-

"اگر کوئی عامل کسی کو ہدفِ ستم بناتے اور اس کی خبر مجھ تک پہنچ جائے۔ اگر میں اس

پر بھی اس عامل کو تبدیل نہ کروں تو اس کا معنی یہ ہوں گے کہ میں نے اس شخص پر ظلم کیا۔"

اس قول سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت رضی اللہ عنہ عوام کے حقوق کی نگرانی میں کس قدر احتیاط فرماتے

تھے۔ ایک مرتبہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ان کے کسی ناروا سلوک پر سخت انتہاء کرتے ہوئے کہا۔

”عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا۔ ان کی ماں نے تو انہیں آزاد بنا تھا۔“

عوام کے دکھ درد میں شریک ہوئے۔ اور ان کی خدمت کے نئے ہر وقت کمر بستہ رہتے۔ اختیار کی فترت  
پیوند لگے کپڑے، انہماکی سادہ غذا، اور بسا اوقات فاتحہ کشی۔ اس سب سے وہ بجا طور پر مفلوک الحال عوام  
کی مجبوریتوں کا احساس کر سکتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عیش و عشرت کے شہستانوں میں خواب ستراجہ  
کے منہ لپٹے ہوئے عزت و افلاس کا احساس کیونکر کر سکتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عشرت کی زندگی کو آسائش و آرام کی زندگی پر ترجیح دی۔ اور اس کی غذا  
یوں بیان فرمائی۔

”میں، خدا کی یہ کچھ نہیں کہیے کر سکتا ہوں جب تک کہ مجھ پر وہ کچھ نہ بیٹے جو اس

پر بیٹھتی ہے۔“

بیت المال کے اثاثہ کو کبھی اپنی جانگاہ اور جائیداد نہیں بنایا۔ ذاتی مورد و نمائش اور آرام و آسائش کے  
لیئے اسے استعمال میں لانے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ آپ برہنہ کرتے۔  
”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ بیت المال میں سے میرے لئے کیا جائز ہے۔ کپڑوں کے دوڑے۔  
نیک عینے، اور دو ہر گرمی کا چغ اور عمرو کے لئے ایک اہرام۔ میرے اور اس درمیان کے لئے  
کس اٹنا کھانا جو فریض کے یک عام آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم۔  
کے بعد میں مسلمانوں کا ایک مرد ہوں۔ جو حال ان کا، سو میرا حال۔“  
مسادات انسانی کی برائیاں ہیں۔ اور بہویت کی یہ غایت ہے کہ منہ نشین حکومت اور اس کے  
اختیارات کو انتظامی اور تو لیتی ادارہ سمجھے۔ جہاں تک کہ تحفظ ذات کے امتیازی اختیارات فنا ہو جائیں  
وہ کارکن جماعت کا تم پرہ جائے۔

## پہلے

### اخلاقی اور نفسیاتی حیرتوں

ایک مثالی معاشرہ جس کا تصور ہمیں قرآن و حدیث کی روشنی میں ملتا ہے اور جس کی عملی تصویر رسول کریم علیہ التَّحِيَّةِ وَالتَّسْلِيمِ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان کی مقدس جماعت کی شکل میں مہیا فرمائی تاریخ کے اوراق اس پاکیزہ اور صالح معاشرہ کی حسین صورت اپنے سینہ پر سجائے ہوئے ہیں۔ ایک بہترین سوسائٹی جس کا ہر فرد اپنی جماعت کے دیگر افراد کے ساتھ دکھ درد، سنج و غم، الفت و محبت، اثر و مودت میں یوں شریک ہے، جیسے ایک ہی جسم کے اعضاء و رگوں اور اعصاب کے رشتوں سے باہم مربوط ہوتے ہیں۔ آنکھ دکھتی ہے تو کل جسم درد کا احساس کرتا ہے کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم بھرا در بیداری میں مبتلا رہتا ہے۔ یوں یوشودن علی انفسہم ولو کان بہم خصاصہ ان کا طرہ امتیاز ہے۔

ایسی اعلیٰ قدروں کی حامل سوسائٹی کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ انفرادی طور پر ہر فرد معاشرہ کے جذبات میں نفسیاتی بنیادوں پر ایک خاص نوعیت کا توازن اور اعتدال پیدا کر دیا جائے کیونکہ انسان اپنی طبیعت کے اعتبار سے متضاد اجزا ترکیبی کا مجموعہ ہے۔ برودت و حرارت، صفراء و سودا، رطوبت اور خشکی، یایوں کہا جائے آگ، پانی، مٹی اور ہوا۔ ان میں سے ہر ایک کا نقطہ اعتدال پر رہنا جسمانی صحت کی علامت ہے اور کسی کا اس نقطہ سے ہٹ جانا خطرہ مرض کا الارم ہے۔

چار طبع مخالف و کشرش      چند روز بوند باہم خوش

گر یکے زین چہار شد غالب      جان شیریں بر آید ز قالب

اسی طرح انسان کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو مختلف بلکہ متضاد جذبات کا مجموعہ دکھائی دیتا ہے۔ ملکوئی جذبات اور بیانیہ احساسات، عقل و روح کا طائر بلند پرواز اور حیوانی و شہوانی

خواہشات کے مزہ و گھوڑا غصہ و غم اور بہت و نفرت۔ اور غور کیجئے ان میں باہمی کس قدر تضاد ہے یہی وجہ ہے ان میں مسلسل تصادم کی سی کیفیت رہتی ہے۔ نیک کامل اور جامع دین کا کام ان میں توازن برقرار رکھنا ہے کیونکہ حیوانی اور شہوانی خواہشات کے بے لگام گھوڑے انسان پر غالب آجائیں تو بہیمانہ احساسات ملکوتی جذبات کو کھیل کر رکھ دیتے ہیں خواہشات نفس طائر عقل و وجدان کو قوت پر واز سے محروم کر دیتی ہیں۔ غصہ و رحم کے جذبات کو رکھ کر دیتا ہے اور نفرت و محبت و اُنس کے دینے بھجھا دیتی ہے۔ ایسی صورت حال میں انسانیت۔ جنسی عیاشی، حیوانیت اور زندگی کی ظلمتوں میں ڈوب ڈوب جاتی ہے اور خاص طور پر جب جذبات و احساسات کا یہ توازن برقرار نہیں رہتا تو سماج کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اہل دل و دن کے اجالوں میں انسانی بستیوں میں انسان کی تلاش کو نکلتے ہیں لیکن انسان نہیں ملتے۔

روشنی کے دور کی ظلمتیں، انتہائی مادی بلندیوں میں یہ اخلاقی لپٹیاں اور انکشاف حقائق کے باوصف خود سے بے خبری اور بے بصیری انہی جذبات کے عدم توازن نتیجہ ہے۔

نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی امت کو "امت وسط" ہونے کا اعزاز

حاصل ہے۔ لڑکپن اور بڑھاپے کا وسط شباب ہے، بخل اور اسراف کا وسط سخاوت ہے

تہور (بغیر سوچے سمجھے خطرہ میں کود جانا) اور تہذیبی کا وسط شجاعت ہے یہی خصائص محمود اور

قابل ستائش میں علم اخلاق کی رُو سے یہی نقطہ اعتدال اخلاقیات کی اساس فراہم کرتا ہے جس

معاشرے کا ہر فرد اس اعتدال اور توازن کا حامل ہو وہ معاشرہ بجا طور پر کنتیم خیر

امت کے خطاب رہانی کا مصداق بن سکتا ہے۔ ایمان کی کسوٹی بھی یہی ہے کہ خواہشات نفسانی

اور سفلی جذبات کو دین مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تابع کر دیا جائے۔ حدیث رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم ہے لا یؤمن احدکم حتیٰ یکون لہوہ تبعاً لما جئت

بہ و تم میرے کوئی شخص مومن نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنی خواہشات میرے لئے

ہوئے دن کے تابع نہ کرے۔

عورت کی حیثیت ازمنہ قدیم سے افراط و تفریط کا شکار رہی ہے۔ جس زمانے میں عورت کسی قسم کی عزت کے قابل نہیں سمجھی جاتی تھی اور اسے بازار کی جنسِ ارزاں سے زیادہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ بچیوں کو زندہ درگور کیا جاتا تھا۔ وہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو عزت و احترام کا حقدار قرار دیا۔ ماں، بہن اور بیٹی کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ اپنے خطبات میں اس صنفِ نازک کے حقوق کی نگہداشت پر زور دیا۔ کیونکہ اسلام ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے۔ ایک گھر اس معاشرہ کی ابتدائی اکائی ہے۔ یہیں سے اصلاحی کام کا آغاز ہوتا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی مشن کا تاریخی جائزہ اس بات کا شاہد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عورت کو بچوں کی پرورش اور تربیت اور خانگی امور سلجھانے کا سلیقہ و ولایت فرمایا۔ انہی صلاحیتوں کے پیش نظر مرد کو کسبِ معاش کے لئے باہر کی دنیا کا مہتمم بنایا تو عورت کو گھریلو امور کی نگرانی کے لئے چراغِ خانہ۔ ایک عورت پر ایک نسل کے اخلاق و کردار کی تعمیر کا دار و مدار ہے عورت جو عفت و حیا کا پیکر ہے وہ خاندان کی عزت، عظمت اور شان کی محافظ ہے۔ اگر ایک عورت کی ردائے عفت و اعذار ہو جاتی ہے تو پورا خاندان مسندِ عزت و وقار سے محروم ہو جاتا ہے۔

عفت و پاکدامنی اور شرم و حیا عورت کا زیور ہیں وہ جنسی جنون کی دست برد سے کیے محفوظ رہ سکتی ہے اگر اسے دفتروں، دکانوں، بازاروں، ہوٹلوں، کلبوں، تھیٹروں، فلم ساز اداروں اور رقص و سرود کی محفلوں کی زینت بنا دیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رحمۃ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا عورت چھپانے کے قابل ہے جب عورت باہر نکلتی ہے تو شیطان اس عورت کو دیکھنے کے لئے مردوں کو راعب کرتا ہے

اسلام انہیں گھر کی چار دیواری میں محبوس نہیں کرنا چاہتا بلکہ ان محرکات کا سدباب

چاہتا ہے جو فتنہ و فساد کا موجب بن سکتے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعے سے پردے کی شرعی حیثیت و نوعیت کچھ یوں ہے۔

۱۔ مومن عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی نگاہوں کو (غیر مردوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

قل للمومنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن  
فروجھن

اور یہی حکم مومن مردوں کے لئے ہے کہ وہ غیر محرم عورتوں کی دید سے اپنی نگاہیں سبست کر دیا کریں کیونکہ نگاہیں نیچی رکھنے کا فعل ایسا ہے جس سے سفلی جذبات کے اشتعال کی روک تھام ہو جاتی ہے اور یوں عفت نفس ممکن رہ سکتی ہے۔ حضور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "لعن اللہ الناظر والمنظور الیہ" (نظر بد سے دیکھنے والا اور خود کو یوں پیش کرنے والا کہ اس کی طرف نظر بد سے دیکھا جائے دونوں اللہ کی رحمت سے بعید ہیں)۔

حضرت جریر نے سوال کیا۔ اگر غیر محرم عورت پر اچانک نظر پڑ جائے تو؟  
آپ نے فرمایا "فوراً منہ پھیر لو"۔ بد نظری زنا کی پہلی سیڑھی ہے۔ اس سے کئی نعتوں کے درپے کھلتے ہیں۔

۲۔ "وہ اپنے سینوں کو اپنی اور عینوں سے اس طرح چھپائیں کہ قطعاً بے ستر نہ ہوں"۔

و لیضربن بخمرھن علی جیوبھن

۳۔ "اپنے اوپر اپنی چادروں کو ٹکایا کریں" دو میدنین علیہن من جلابیہن

اس آیت کی تفسیر میں حضرت عباسؓ کا قول ہے "اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے

کہ جب وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو سر کے اوپر سے اپنی چادروں کے دامن ٹکاکر اپنے چہروں کو

ڈھانک لیا کریں"



علامہ ابو بکر عاصم لکھتے ہیں :- ”یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو ان عورتوں کو ہونے سے چہرہ چھپانے کا حکم ہے۔ اور اسے گھبر سے نکلنے وقت پردے کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ آیت لوگوں کو اس سے تعزین کرنے کی ذرا بھی جرات نہ ہو سکے“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے :- ”سوار ہمارے قریب سے گذرتے تھے اور ہم رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حالت احرام میں تھیں پس جب وہ لوگ ہمارے مقابلہ آجاتے تو ہم اپنی چادریں اپنے سروں سے کھینچ کر اپنے چہروں پر ڈال لیتیں اور جب وہ گذر جاتے تو مت کھول لیتی تھیں“

۴۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے (یعنی زینت) اس کا حال معلوم ہوتا (یعنی ان کی آواز اور جھنکار سنائی دے)

”ولا یضربن بآرجھن لیعلم ما یخفون“

اور

”ولا یبدین زینتھن“

۵۔ اور جاہلی رسوم زیبائش اور حسن نمائی کا مظاہرہ نہ کریں۔  
”ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الاولی“

پیغمبر و دعائم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو جاہلی رسوم بد سے نجات دلائی۔ انہیں عزت و آبرو اور معاشرتی وقار و اہمیت دلایا۔ دور جاہلی میں ان کی عائلی زندگی جہالت اور بدکاری سے عبارت تھی۔ کھلے بندوں ننگے ہو کر نہانا یہاں تک طوافِ کعبہ ننگے بدن کرنے کی رسم کا علاج تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لعنتِ بد کا خاتمہ کیا۔ زیب و زینت کے نمائشی مقابلوں کو ختم کیا۔

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :- ”دو زخیوں کی دو قسمیں ہیں ایک کو میں نے نہیں دیکھا۔ دوسرے وہ عورتیں جو لباس تو پہنے ہوں گی۔ مگر برہنہ ہوں گی۔ نماز

سے شانوں کو گھما کر پچکار چال سے چلیں گی۔ ان کے سر بختی اونٹوں کے پچکار کو ہان کی طرح ہونگے ایسی عورتیں جنت میں داخل نہ ہوں گی۔ اور نہ جنت کی خوشبو پائیں گی۔

غور کیجئے: دور جاہلی کی جاہلیت آپ نے علامت فرمائی۔ ذرا اس علمی، عقلی اور سائنسی دور کی جاہلیت بھی دیکھیے۔ بیٹھڑوں، رقص گاہوں، فلم سازی کے مراکز میں عورتوں کے برہنہ اور بیجاں انگیز مظاہراتِ حُسن۔ باغوں میں مردوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ہلا کر گشت کرنا۔ پارکوں میں عیاشیاں کرنا۔ رقص و سرود کی محفلوں میں بے حیائی کا مظاہرہ کرنا۔ بازاروں میں نمائشِ حُسن کا اظہار کرنا۔ آرٹ اور ثقافت کی آرٹ میں صنم نازک کو اپنی جنسی خواہشات کی بھینٹ چڑھا کر اسے تنگ کرنا۔ عربانِ تصویروں میں بوس و کنار اور اختلاط و ارتباط کے مناظر دکھانا۔ اور فحش اور گندے لٹریچر میں عشقیہ افسانوں اور ناولوں سے تسکینِ جنس کے سامان تلاش کرنا کیا اس دور قبل از اسلام کی جاہلیت سے کم ہے؟

۶۔ عورتوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھی رہیں۔

### وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ

اگرچہ یہ آیات ازواجِ مطہراتِ نبی کریم علیہ السلام سے متعلق ہے تاہم فقہائے کرام نے دیگر آیات اور احادیث سے استنباط کیا ہے کہ دوسری مومن عورتوں کے لئے پردہ کی نوعیت حالات کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اگر فتنہ عام ہو جائے تو ایسے حالات میں ہتھیلیاں اور چہرے جوڑھانپنے سے عمومی حالات میں مستثنیٰ ہوتے ہیں کاڈھانپنا بھی ضروری ہے۔

وقتِ ضرورت گھر سے باہر جانے کی بھی اجازت ہے مگر کچھ شرائط کے ساتھ۔

۱۔ بن سنور کرنے نکلیں کہ طبیعتیں ان کی طرف مائل ہوں عصمتِ بآبی کا پورا لحاظ رکھا جائے اور نمائشِ حُسن کی بھی مقصود نہ ہو۔

۲۔ رفتار میں لچک یا کوئی خاص امانہ ہو۔ اور نہ یور کی جھنکار نہ سنائی دے کہ نگاہیں متوجہ ہوں۔

۳۔ باریک اور چست لباس نہ ہو۔ اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو لباس پہن کر بھی تنگی رہتی ہیں۔

۴۔ عطرانہ غم شبونگا کہ دعوت گناہ کا قصد نہ کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا کہ جو عورت عطرنگا کہ لوگوں کے درمیان گزرتی ہے وہ آوارہ قسم کی عورت ہے۔ حدیث رسول ہے:-

”المردة اذا ستعطرت خموت بالمجلس فهي كذا وكذا“

اسلام میں اس فتنے سے بچنے کے لئے کئی احتیاطی تدابیر بھی اختیار کی گئی ہیں۔ مرد و زن یک آزادانہ اختلاط جس سے بد اخلاقی کے فتنے جنم لے سکیں خواہ وہ کلیوں میں ہو یا مساجد میں یا اسکولوں اور کالجوں میں بہر صورت ممنوع ہے۔ گرچہ مساجد میں جانے کے لئے بنیادی طور پر اجازت ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں معمول تھا لیکن اگر فتنہ کا خطرہ ہو فقہانے اس کی مراحت کی ہے کہ ایسی صورت میں اجازت نہیں دی جاسکتی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے حالات میں عورت کی نماز بہ نسبت مسجد کے گھر میں بہتر ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے۔ لوگو! اپنی عورتوں کو مسجدوں میں ناز کے ساتھ آنے سے بند کرو۔ کیونکہ بنو اسرائیل پر خدا کی لعنت اس وقت آئی تھی جب ان کی عورتیں بن سنور کہ مسجدوں میں جانے لگیں۔

حضرت عبداللہ بن مکتوم کا شانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ اور ام سلمہ سے فرمایا کہ وہ ان سے پہلو کر لیں“ عرض کی گئی کہ وہ تو نابینا ہیں“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا“ تم تو دیکھتی ہو“

اسلام میں تو یہاں تک اہتمام ہے کہ اگر غیر محرم عورتوں سے کوئی چیز مانگنا چاہیں تو دیوار کے نیچے سے مانگیں“ فاستلوهن من وراء حجاب“

قرآن و حدیث کی ان تصریحات کے باوجود عمارت اور قائمین، دانشور اور سفینہ ملت کے نگہبان اس مسئلہ کی نزاکت کا کیوں احساس نہیں کرتے؟

وہ سر عام عورتوں کے چہروں سے نقاب نوچتے اور اس کی تعلقین کرنے پر کیوں مُصر ہیں؟

یہاں اس تہذیبِ نوری کا جس نے مسلسل ملحدانہ فکر سے قومی غیرت اور دینی حمیت کے اعصاب کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ عورتوں کے چہروں سے پردہ کیا اٹھا کہ مردوں کی عقل پر پڑ گیا۔ اندھی تقلید سے خوب ناخوب کی تیز اٹھ گئی اپنے سر کی آنکھوں سے یورپ میں عائلی زندگی جہنم زار ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ اسے عبرت پذیری کے قابل ہی نہیں گردانتے۔

ذرا تصور کیجئے اگر اس عام عریانی اور آزادانہ اختلاط سے روکی نگاہ بدہیں اور اٹھ سکتی ہے اور ایسے ہی عورت کی نگاہ انتخاب اٹھ سکتی ہے تو کیا ممکن نہیں کہ یہی فعل زوجین کے مابین نفرت کے بیج بودے اور پھر اس شجرہ ضبیثہ سے سابقہ زندگی کی رفاقت کے لمحات زوجین کی نگاہ میں اپنی اہمیت کھو بیٹھیں۔ اور پھر یہ واقعہ ہے کہ معاشرتی طور پر میاں بیوی کے ناخوشگوار تعلقات طلاق و علیحدگی کی واردات بچوں کی شخصیت اور کردار کی تعمیر میں بدترین اثرات مرتب کرتی ہے اور پھر وہ نسل جب زندگی کے عملی میدان میں آتی ہے تو معاشرہ مجموعی طور پر ان مصزات اور مفسد سے ملوث ہو جاتا ہے۔

اگر اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی برائیاں بالکل واضح ہیں اس کے لئے لمبی چوڑی مہتد کی ضرورت نہیں، شرکیوں، بازاروں، اسکولوں، کالجوں میں عام چھیڑ چھاڑ، آوازے کنا اغوا کی واردات، عصمت درسی کی قبیح حرکات سے متعلق مزاد اور اخبارات کی شہ سرخیاں ہی تلخ حقیقت کی گواہ ہیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ پردہ عصری سائنسی اور تکنیکی ترقی میں زبردست رکاوٹ ہے۔ حالانکہ یہ ایک خیالِ خام ہی ہے، اسلام عورتوں کی تعلیم سے نہ پہلے غافل رہا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، صحابیات کے علاوہ کئی مسلم خواتین کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں، جن کی حدیث، فقہ، علم و ادب اور سیاست میں گراں قدر خدمات ہیں ہاں اسام کے ہاں عورتوں کی تعلیم سے متعلق ایسا کوئی تصور نہیں جس میں معاشرہ کی اخلاقی قدریں ہی دھڑام سے گر جائیں، ان کیلئے پاکیزہ ماحول بنانا حکومتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے جس میں وہ اس نوعیت کے عینی محرکات کی زد سے بچ کر علم و فن اور ملک و ملت کی بہترین انداز میں خدمت کر سکیں۔

## قانون اور احترامِ قانون

ترجمہ: محمد شریف سیالوی ایم اے ایل ایل بی

قانون اور اخلاق کا باہمی چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہے۔ ان کا باہمی تعلق کچھ یوں ہے، قانون شکل ہے تو اخلاق اس کا مادہ۔ قانون اگر ایک جسم فرض کیا جائے تو نظامِ اخلاق کی حیثیت ایک روح کی سی ہے۔ حیات جس طرح اتصالِ جسم و روح کا نام ہے اسی طرح نسی توہم و ملت کی فعال زندگی بھی نظامِ قانون اور نظامِ اخلاق کے باہمی اتصال اور تعامل سے عبارت ہے۔ جس طرح جسم بغیر روح کے بے جان اور جمود کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح کوئی بھی نظامِ قانون بدون اخلاقی احساس کے قوت و حرکت سے محروم ہو جاتا ہے۔ امتیاز کی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ قانون کا تعلق قالب سے ہے اور اخلاق کا قلب سے۔ قانون کو سلسلہ نفاذ میں اولیت حاصل ہے یا اخلاق کو؟ یہ ایک مسئلہ ایسا ہے جیسے پوچھا جائے مرغی پہلے ہے یا انڈا۔ یوں تو قانون کا مندرجہ اور اخلاق کی حکمرانی کے مابین تقدم و تاخر کے اعتبار سے امتیازی بکیر کھینچنا بہت مشکل ہے۔

نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بحث کہ اسلام کو دعوۃ نافرمان کیا جائے یا بتدریج ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ نفاذِ اسلام کے قانون کے نفاذ سے قبل اصلاحِ اخلاق ضروری ہے یا اصلاحِ اخلاق کے لئے نظامِ قانونِ اسلام کا نفاذ ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام ایک کل ہے اور نظامِ اخلاق اور نظامِ قانون اس کے دو لانیفک پہلو ہیں، اسلامی نظامِ زندگی میں صرف جسم و قالب کی سرگرمیوں کی تحدید و تعین نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قلب و روح کی تطہیر اور تہذیبِ نفس کا بھی اہتمام ہے۔ لہذا اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ سماجی اور اخلاقی اقدار جن کی حکمرانی دنیائے شعور اور لاشعور پر بھی ہوتی ہے انہیں پیشِ نظر رکھے بغیر کوئی بھی نظامِ قانون کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کسی بھی نظامِ قانون کی کامیابی کا انحصار احترامِ قانون کے اجتماعی احساس کے ممکنات پر ہے، ایسا قانون جسے اخلاق

اقدار کی تائید حاصل نہ ہو اس کی کامیابی کے امکانات دہونے کے برابر ہوتے ہیں، برصغیر اور مسلمانانِ عالم کا استعماری نظام قانون کے خلاف ہمیشہ برسرِ پیکار رہنا اس کی واضح دلیل ہے۔ نتیجتاً اخلاقِ اقدار کے نفاذ یا تصادمِ نظامِ قانون اپنا اثر کھو بیٹھا ہے۔ پورا نظام عدالت و قانون لطائفِ الحیل بن جاتا جس کی وجہ سے غریب فرد کے لئے حصولِ انصاف جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں ہوتا۔ اخلاقِ سپرٹ دہونے کی وجہ سے سارا زور قانونی موٹو گائیوں پر لگ جاتا ہے اور یوں قانون کی روح کا سرعام خون ہونے کا رہ جاتا ہے۔

نظامِ قانون سے معرفت معنوں میں عدالتوں کا قیام عمل میں آتا ہے جس کی نگرانی صحیح اور منصف کرتے ہیں۔ نظامِ اخلاق میں مقدمات کو سماعت کے لئے ضمیر کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے "ضمیر" ایک ایسا جج ہے جو اپنے فیصلے میں غلطی نہیں کرتا، اس کی رسائی اعمالِ ظاہر کی صحت اور عدم صحت تک ہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ان محرکات کا بھی کھوج لگا سکتا ہے جو ظاہری اعمال کے پس منظر میں ایک زبردست قوت کی حیثیت سے کام کرتے ہیں

جرائم کے انداز میں نظامِ قانون صرف اس حد تک مفید ہے کہ اس کی گرفت کے خوف سے منظر عام پر پائی کا خاتمہ ہو سکتا ہے لیکن یہ کہ وہ بُرائی چوری چھپے بھی نہ ہو، نظامِ قانون سے باہر ہے اور برائی کا استحصال اور سرے سے خاتمہ نظامِ اخلاق ہی سے ممکن ہے۔ پابندیِ قانون اور احترامِ قانون میں باریک سگر نہایت اہم فرق ہے۔ تعزیریاتی نظامِ پابندیِ قانون تو سکھا سکتا ہے احترامِ قانون کا سبق نہیں دے سکتا۔ یہ نصیبِ نظامِ اخلاق کو حاصل ہے۔

اس بحث کا حاصل مقصد یہ ہے کہ قانون اور اخلاق کے باہمی ارتباط اور تعامل سے ہی حقیقی انصاف، معاشرتی امن و سلامتی اور ملکی و ملی استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔ اسلامی نظام کا عملی نفاذ اپنے صحیح معنوں میں اسی صورت میں ممکن ہے جب ان دونوں پہلوؤں کو ایک ساتھ عملی شکل دی جائے۔ انفرادی اصلاح جس کی بنیاد تقویٰ اور خوفِ الہی ہے یہی اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ قانونی ضابطے اور تعزیریاتی نظام ایک متناسب کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی اصلاح کے لئے

تقویٰ پر بہت زور دیا ہے۔ اور فرمایا کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے۔ آپ نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، 'تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے'۔ یہی قلب تقویٰ کا محل ہے اور اعمال کی جائے صدور، جو اس کے اعمال قلب کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر قلب خشیت الہی اور محبت رسول سے مملو ہو تو اعمال خود بخود درست ہو جاتے ہیں، بایں ہمہ اگر غفلت یا فزا شہوات سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی تو فوراً احساسِ ندامت دامن گیر ہو جاتا ہے۔

نفسِ توامہ کی سرزنش سے انسان اپنا احتساب کرتا ہے اس حاسرہ اخلاق کے بیدار ہونے کی صورت میں انسان اپنا ہر مقدمہ ضمیر کی عدالت میں پیش کرتا ہے وہ اپنے کئے کو چھپانے کے لئے جھوٹ اور حیلہ کا سہارا نہیں تلاش کرتا بلکہ اعترافِ جرم اور سزا کو قبول کرنے میں بہتری خیال کرتا ہے۔ قرآنِ اولیٰ میں بیداری ضمیر کی بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی جرم کا ارتکاب کر بیٹھا تو اس نے خود کو اعترافِ جرم کے ساتھ عدالت میں پیش کر دیا اور عدالت کے فیصلہ کو بطیب خاطر قبول کر لیا کتب حدیث میں حضرت ماعذ کا واقعہ مذکور ہے وہ بدکاری کر بیٹھے، ضمیر نے سخت ملامت کی اور حاسرہ اخلاقی نے زبردست سرزنش، سیدھے بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے پاک کیجئے۔ رسول اللہؐ نے انہیں تین مرتبہ لوٹایا اور فرمایا کہ غور کرو کیا کہہ رہا ہے لیکن وہ مصر ہے حتیٰ کہ ان پر حد لگائی گئی اور یوں بارگاہِ خداوندی میں کامیاب و کامران ہو گئے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ قانون کا وظیفہ فرائض و حقوق کے تعین اور تقسیم ہے۔ حقدار کو حق دلانا، اور فرض کی انجام دہی کا پابند بنانا بصورتِ خلافِ دینی سزا دینا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ حق کو بطیب خاطر تقسیم کرنے اور فرض کی انجام دہی کا احساس کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ اس کا جواب واضح ہے، یہ تقسیم و احترامِ ایمان کا تقاضا ہے، خدا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اطاعت کا جذبہ ہی احترامِ حقوق اور احساسِ فرض شناسی کی بنیاد ہے

جسٹس گواہی، غلط بیانی اور حقائق کو توڑ کر پیش کرنا جو تقریباً ہمارے معاشرہ کی ایک مستقل روایت بن چکی ہے، اس کی اصل وجہ اخلاقی کمزوری ہے۔ یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ اسلام میں اخلاقی اقدار

کا انقطاع دراصل نتیجہ ہے ایمان و یقین میں گمراہی کا۔ ایک مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت صرف اخلاقی فریضہ ہی نہیں بلکہ یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا کہ ایک مسلمان کی جان، اس کا خون اور مال و عزت دوسرے مسلمان کے لئے اتنا ہی قابل احترام ہے جتنا کہ آج کا دن، یہ مہینہ اور یہ شہر۔

اسی طرح حلال و حرام کی تمیز، حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھنا مومن کی اندرونی خصوصیت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ با اوقات عدالت میں مقدمہ پیش کیا جاتا ہے اور ایک شخص زبان و بیان پر قدرت کی وجہ سے فیصلہ اپنے حق میں کروا لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ برگزنہ نہیں کہ وہ چیز اس کے لئے حلال ہو گئی۔ اسی طرح عدالتی کارروائی اور فیصلہ ظاہر حال پر ہوتا ہے لیکن آخری ثواب و عقاب اور جزا و سزا قاضی کے فیصلہ پر نہیں۔ ظاہری دنیا کے احکام تو اسی فیصلے پر طے ہونگے لیکن حقیقت حال تو خدا سے پوشیدہ نہیں لہذا آخری انجام سے چھکارا کی کوئی گنجائش نہیں۔ مومن تو بہر حال مکافات عمل کے روز پر ایمان رکھتا ہے صرف قاضی کا فیصلہ اطمینان قلب کے لئے کافی نہیں تا وقتیکہ ضمیر بھی اس کے حق میں فیصلہ دے دے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے استفسار پر فرمایا :

"استفتت قلبك" اپنے دل سے فترتی لے۔

اگر ہم گرد و پیش کا جائزہ لیں اور آئے روز ہونے والے فسادات اور تباہیوں کا تجزیہ کریں تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ حدت و حرمت کے معیارات کا احترام جو ایمان میں داخل ہے روز بروز کم ہو رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کئی اخلاقی ضابطے جرائم کا سدباب کرتے ہیں، جو قابل تعزیر اور حد ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص نے بارگاہ رسالت میں شکایت کی کہ اہل میں بہت سی شکایات ہیں مثلاً زنا، سرتہ، اور جھوٹ بولنا وغیرہ اور یہ کہ ان سب کا فوری طور پر چھوڑ دینا اس کے لئے ممکن نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو مجھ سے جھوٹ نہ بولنے پر آمادہ رہتا ہے؟ چنانچہ وہ شخص بہت خوش ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے سب سے آسان کام



اس نئے عہد کی وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ اس کے بعد جب بھی وہ حسب عادت کسی بُرائی کا قصد کرتا تو معاً خیال آتا کہ اگر مجھ سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پوچھ لیں تو کیا جواب ہوگا، اگر وعدہ کی پابندی کرتے ہوئے سچ کہوں تو سزا سے نہیں بچ سکتا اور اگر جھوٹ بولتا ہوں تو وعدہ کی خلاف ورزی۔ نتیجتاً ان ساری برائیوں سے نجات مل گئی۔ یوں اسلام میں جہاں جرائم کے سدباب کے لئے نظامِ تعزیرات و حدود ہے وہاں تطہیرِ قلوب اور اصلاحِ احوال کا اہتمام بھی کیا گیا ہے، ترہیب و ترغیب دونوں طریقوں سے ہی برائی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ نظامِ تعزیرات ترہیب کی رُو سے تو نظامِ اخلاق ترغیب کی۔ انسانی نفسیات فطری طور کچھ ایسے واقعات ہوتی ہے کہ انہیں کی اصلاح کے لئے تہذیب اور تلقین دونوں کی مساوی ضرورت ہے ان میں سے کسی ایک سے بغاوت ممکن نہیں۔ مصطفوی کے نفاذ کی لہجہ ہے، اظہار ہے ان دونوں کی اجراء و نفاذ کے بغیر وہ نفاذ حاصل نہیں ہو سکتے جو اس نظامِ رحمت کا ناس ہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں معاشرہ میں امن و سلامتی عزت نفس کی حفاظت کے لئے جرائم کے مرتکب افراد کی سخت گرفت کا حکم دیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی نرمی کو رد نہیں رکھا گیا۔ دلائل اجتماعی ماحول کو سچی اور تشوئی کا مظہر بنانے کے لئے دعوتِ اِشاد و تبیین کے شعبہ کو حکمت و معرفتِ حسنہ کے اصول پر چلانے کا حکم دیا۔ اسلامی حکمرانوں کا فرض اٹا نہیں کہ وہ تعزیرات کو نافذ کریں اور بس بلکہ قرآن و سنت کی تعلیمات کو فروغ دینا اور نفاذی قدروں کی موثر انداز میں تبلیغ بھی اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے احترامِ نبوت، عظمتِ شہادت اور اکابر دین و ملت کے احترام کی حفاظت کرنا اور ان کے منافی سرگرمیوں کا سدباب اور اس نوعیت کے دیگر امور بھی اتنے اہم ہیں جتنا کہ قانون کا نفاذ۔

ایک اہل حقیقت ہے کہ اگر ابلاغِ نامہ سے ذرائعِ مذکورہ مقاصد کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں اور عقائد کی مضبوط دیواروں میں شکات ڈال کر اخلاقی اقدار کو متزلزل کر دیں تو پھر قانون بھی تو تباہی ناکہ اور قوتِ تاثیر سے محروم ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی پیش رفت خوش آئند ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی نظام کے بہار آفریں عہد سے دامنِ حیات کو اطمینان و سکونِ قلب کے پھولوں سے بھرنے اور کشتِ حیات کو نظامِ مصطفیٰ اصلی اللہ علیہ وسلم سچاپِ رحمت کے زندگی بخش چینیٹوں سے سیراب کرنے کے لئے اسلامی حقائقِ زندگی، نظامِ اخلاق و معاشرت کی موثر اور دلنشین انداز میں تبلیغ کے لئے تمام تر ممکن وسائل کو بروئے کار لایا جائے۔

# پہلے

## اور اس کے شرعی حیثیت

ادارہ کے زیر اہتمام محفل معاصرین منعقد ۲ جولائی ۱۹۸۱ء میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔

انسان فطری طور پر اپنی بقا کے لئے بہت سے مادی وسائل کا محتاج ہے۔ اپنی بنیادی ضروریات کی تسکین کے لئے وہ ان وسائل کی جستجو اور استعمال میں ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو صرف کرتا ہے۔ اس غرض سے کہ اس کی حاجات پوری ہو سکیں وہ اس مقصد کے لئے نئی راہیں تلاش کرتا ہے اور نئے نئے طریقے وضع کرتا ہے۔ تاریخ علم معاشیات کا مطالعہ اس لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے کیوں کہ انسان نے بنیادی ضروریات کی تکمیل، ناگہانی آفات سے بچاؤ، تحفظ ذات و املاک اور حصول آسائش کیلئے کیسے انداز اپنائے، نئے نئے معاشی تصورات و نظریات پر وسیع معاشی نظا ہائے زندگی کی بنا ڈالی۔ ان فکری اور عملی سرگرمیوں کا دائرہ معیشت کے تمام پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔

نظام بیمہ کی موجودہ شکل اسی بنیادی احساس اور ارتقائے فکر کا نتیجہ ہے جو بحیثیت نظریہ اشخاص و املاک کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، کیوں کہ زندگی عبارت ہے مختلف حوادث و واقعات سے جو زندگی کے کسی بھی مرحلہ پر واقع ہو سکتے ہیں اور یوں یہ املاک اشخاص کے لئے باعث خطرہ ہیں۔ اس غیر یقینی صورت حال کا نتیجہ احساس عدم تحفظ ہے نظام بیمہ کا بنیادی مقصد ان ممکنہ خطرات سے ایک فرد پر واقع ہونے والے نقصان اور

ضرر کو متعدد افراد پر تقسیم کر کے ایک فرد کی ذمہ داری میں ایک جماعت کو شریک بنانا ہے۔ اس لئے علماء و قانون کی نگاہ میں نظم بیمہ ایک قسم کا امداد باہمی کا ادارہ ہے جس کے ارکان مقرر وقت پر چندہ دیتے رہتے ہیں اور جب ان میں سے کوئی فوت ہو جائے تو اس کے ورثاء کی امداد کے لئے ان کو اجتماعی اندوختہ میں سے موعودہ رستم مل جاتی ہے۔

اس ادارہ کے شرکا جنہیں خطرات کا سامنا ہوتا ہے وہ مخصوص اور معینہ مقدار میں چندہ باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک پر بالفعل خطرہ واقع ہونے پر دوسرے اپنے بعض حصص کی قربانی سے اس بڑے نقصان کی ذمہ داری اٹھانے میں شریک ہوتے ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ بیمہ باہمی تعاون و ضمانت کا وہ نظام ہے جس میں خطرات، مصائب اور نقصانات کو بیمہ داروں کی مجموعی حاصل شدہ اتساط میں سے مصیبت زدہ یا نقصان زدہ کو بطریق معاوضہ ادا کیگی کی جاتی ہے تاکہ نقصان اٹھانے کی ذمہ داری ایک فرد پر نہ رہے۔

ایک نظریہ کی حیثیت سے نظام بیمہ تعاون کی بہترین مثال ہے۔ شریعہ اسلامیہ تعاونی علی السبیل پر مبنی ہر ایسے عمل کو مستحسن سمجھتی ہے۔ جیسا کہ بیمہ کی تعریف سے ظاہر ہے بنیادی تصور نقصان کی ذمہ داری اٹھانا اور دوسرے شخص پر ضمانت کا منتقل کرنا ہے۔ یہ تصور فقہ اسلامی میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً قدیم زمانہ قبل از اسلام سے "عائتہ" کا نظام اہل عرب میں پایا ہے جس میں خون بہا کی ادائیگی ایک فرد کی بجائے اس کے خاندان کے افراد پر سیم کر دی جاتی ہے۔ کیوں کہ ایک فرد کے لئے غالباً یہ ممکن نہیں کہ وہ خون بہا کی رقم تنہا ادا کر سکے گویا خون بہا کی رقم بطور ضمانت پورے قبیلہ کو منتقل ہو جاتی ہے۔ بیمہ میں بھی تقریباً یہی صورت حال ہے کیوں کہ اس میں وقوع خطرہ اور نزول آفت میں تدارک نقصان کی ذمہ داری اور ضمانت دوسرے افراد کو منتقل کر دی جاتی ہے۔

اسی طرح یہ تصور عقد موالاۃ میں بھی ملتا ہے جس میں ایک نو مسلم دوسرے مسلمان کے

ساتھ عقد کرتا ہے۔ اس بنیاد پر کہ اگر وہ (مسلم) اس سے سرزد ہونے والی خطائی جنایات میں مالی ضمان برداشت کرے تو وہ اس کے شرعی ورث کی حیثیت سے اسکے مرنے پر وراثت پائے گا۔

بیمہ زندگی میں ایک اور خوبی جو نظر آتی ہے وہ مرنے والے کے ورثاء کو قسم بیمہ کی ادائیگی ہے۔ وراثت کو خوشحال چھوڑنے کا یہ طریقہ حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ اپنے ورثاء کو غنی چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ وہ کشکول گدائی لئے پھریں۔ اس لئے ایک تہائی سے زیادہ وصیت کے ممانعت فرمائی۔

ان حقائق اور مویذات کی روشنی میں نظام بیمہ نظریہ کی حیثیت سے اسلامی ریاست کے بنیادی فرائض اور مقاصد کی تکمیل میں مدد ثابت ہو سکتا ہے۔ اس حد تک علماء اسلام متفق ہیں البتہ نظام بیمہ کی عملی شکل اور معاہدہ بیمہ کی تحویں میں اختلاف ہے۔ اسلئے یہ فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بیمہ بحیثیت نظریہ اور بیمہ بحیثیت معاملہ اور عقد۔ جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے۔ اس کے شرعاً مستحسن ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ دوسری صورت قابل بحث ہے۔

کیوں کہ بظاہر ایک کام مطابق شرع ہوتا ہے لیکن وہ وسائل جو اس کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ شرعاً حرام ہوتے ہیں اور ان حرام وسائل کی وجہ سے وہ معاملہ بھی غیر شرعی قرار پاتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک طوائفہ حرام کاری سے دولت جمع کرتی ہے۔ اس لئے کہ وہ مسجد تعمیر کروائے یا خیرات دے، گو مسجد کی تعمیر اور خیرات بذات خود مشروع کام ہیں لیکن وسائل و ذرائع اس کام کے غیر شرعی ہیں اسلامی نقطہ نگاہ سے معاملات کی صحت و حلت کا ضابطہ یہ ہے کہ مشروع مقاصد مشروع طریقوں سے حاصل کئے جائیں۔ اس لئے نظام بیمہ میں تعاون باہمی کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے جھٹ کہہ دینا اسلام کے عین مطابق ہے۔ سلام

سے بے خبری کی دلیل ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس "تعاون" کے لئے جو ذرائع اور طریقے استعمال کئے گئے ہیں وہ بھی شرعاً جائز ہیں یا نہیں۔

استاذ ابو زہرہ مصری نے بیمہ پر بحث کرتے ہوئے کہا اگرچہ اس کی اصلیت تو تعاون محض تھی لیکن اس کا انجام بھی اس ادارہ کا سا ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں ہوا کہ یہودیوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد تعاون علی البر والفقوی تھی اسے ایک ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا جس میں قمار اور ربوہ دونوں پائے جاتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیمہ کی موجودہ شکل کا تجزیہ کیا جائے۔ جیسا کہ قانون بیمہ میں عقد بیمہ کی تعریف کی گئی اس اعتبار سے بیمہ ایک معاملہ اور معاہدہ ہے جو بیمہ دار اور بیمہ کنندہ کے درمیان طے پاتا ہے۔ بیمہ کنندہ حکومت، کوئی انجمن یا نجی کمپنی ہو سکتی ہے۔ پہلی صورت اجتماعی یا ریاستی بیمہ کی ہے جس کا انتظام حکومت کے ہاتھوں ہوتا ہے دوسری صورت تبادلی بیمہ کی ہے جس کی تشکیل رفاہی انجمنوں و پیشہ دارانہ تنظیموں کے ذریعے ہوتی ہے۔

تیسری صورت بیمہ کمپنی کی ہے جس میں نجی کمپنی، دوسری تجارتی کمپنیوں کی طرح بیمہ کاروبار کرتی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے:

اجتماعی بیمہ میں حکومت شعبہ صنعت و حرفت مثلاً کان کنی وغیرہ میں کام کرنے والے مزدور طبقہ کے لئے بیمہ کا اہتمام کرتی ہے اور یہ عموماً لازمی ہوتا ہے۔ اس بیمہ کاری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کام کے دوران واقع ہونے والے حادثات، بیماری، بڑھاپے وغیرہ کی صورت میں مزدور صنعت کار اور حکومت کے مجموعی چند سے آفت زدہ یا اس کے پسماندگان کی مدد کی جائے۔

تبادلی بیمہ میں وہ تمام افراد جنہیں خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اپنے خطرہ کی نسبت سے

سالانہ یا ماہانہ چندہ ادا کرتے ہیں اور ان میں سے کسی کو بالکل خطرہ لاحق ہو تو اپنے مجموعی، اندوختہ سے اسے معاوضہ دیتے ہیں۔ اگر یہ عوض اس کی ادا کردہ اقساط سے کم مالیت کا ہو تو اس کی بقیہ قسطوں کی مالیت کم کر دی جاتی ہے اور اگر عوض زیادہ ہو تو زائد قسطوں سے وہ رقم پوری کر دی جاتی ہے۔ بسا اوقات رہنماہی اور خیراتی ادارے اس کی بقیہ اقساط کو پورا کر دیتے ہیں۔ یوں اس بیمہ میں قسط کی مقدار کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔

کپنی بیمہ کا انتظام نجی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بیمہ دار اور کپنی کے درمیان معاہدہ طے پاتا ہے بیمہ کپنی زندگی اور موت کے وسیع اعداد و شمار اور بیمہ دار کی صحت اور اشیاء کی نوعیت، اپنے کل بیمہ داروں کی تعداد اور کل آمدن کے تناسب سے ایک قسط کی قیمت مقرر کرتی ہے جو بیمہ دار کو ماہانہ یا سالانہ باقاعدہ ادا کرتا ہوتا ہے۔ اس کے مقابل کپنی بیمہ دار یا اس کے ورثاء کو وقوع خطرہ یا انتہائی مدت پر رقم بیمہ مع سود ادا کرنے کی پابند ہوتی ہے جس کا تعین وقت معاہدہ ہو جاتا ہے۔

بیمہ کپنیاں اپنے روپے سے جو بیمہ داروں کی اقساط سے حاصل ہوتا ہے، وثیقے خریدتی ہیں جن پر انہیں سود ملتا ہے یا اسے اپنے کاروبار میں لگاتی ہیں۔ بیمہ زندگی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ضمانت پر مشتمل نہیں البتہ بیمہ بحری اور آگ کا بیمہ معاہدہ ضمانت پر مشتمل ہے یعنی آگ لگنے اور غرق ہونے کی صورت میں اقساط کے مقابل رقم بیمہ بطور ضمانت برائے تدارک نقصان ادا کی جاتی ہے۔

جب طے ہے کہ بیمہ ایک عقد اور معاملہ ہے تو اس کی صحت و حجاز کا فیصلہ اسلام کے نظریہ عقد کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی نظریہ عقد کی رو سے فساد کی وجوہ غرر، تمہار، اکراہ، افراد، عدم ضمانندی اور حقوق علیہ کا عدم وجود ہے۔

معاملہ غرر کے معنی میں مستورا یا عاقبتہ ہونا یعنی ایسا معاملہ جس میں جہالت ہو۔ جہالت

کبھی شئی معقود علیہ میں ہوتی ہے کبھی قیمت میں بھی وقت حوالگی ثمن یا تسلیم شئی معقود علیہ میں۔ یا اس کے ہونے اور نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو یہ معاہدہ عقد کے اندر ایسی جہالت اور ابہام سے عبارت ہے جو فریقین عقد کو نزاع کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لئے اسلام نے ایسی بیع اور عقد سے منع کیا اس کی مثال پھلوں کے پکنے سے پہلے درخت پر فروخت کی ہے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے پکنے سے پہلے کسی آفت کے نتیجہ میں پھل ہی نہ حاصل ہو سکے۔ اسی طرح جانور کے شکم میں حمل کی فروخت وغیرہ۔

بیمہ کی پہلی دو چھوڑ کر تیسری قسم بیمہ جسے کمپنی بیمہ کا نام دیا گیا سراسر معاہدہ غریبہ کیوں کہ اس میں بیمہ کمپنی بیمہ دار سے عقد کرتی ہے اگر خاص خطرہ واقع ہوا تو وہ بیمہ دار کو مخصوص رقم بیمہ ادا کرے گی، خواہ بیمہ دار نے ایک ہی قسط ادا کی ہو اور اگر خطرہ لاحق نہ ہوا تو اختتام مدت پر وہی مخصوص رقم بیمہ دار اور اس کے ورثاء کو ادا کرے گی جبکہ جسٹس اقساط کی ادائیگی بھی ہو چکی ہو۔

اس معاملہ میں یہ یقینی امر نہیں کہ بیمہ دار کتنی رقم کتنی اقساط میں کمپنی کو ادا کرے گا۔ فرض کیا ایک شخص بیمہ زندگی میں دس ہزار کی پالیسی دس سال کے لئے ایک ہزار سالانہ پر خریدتا ہے اگر دوسرے سال اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو کمپنی اس کے ورثاء کو دس ہزار رقم ادا کرے گی جبکہ اس کے عوض بیمہ دار نے صرف ایک ہزار روپیہ دیا۔ گویا اس معاملہ میں اس بات کا علم نہیں کہ بیمہ کمپنی کو کتنی قسطیں حاصل ہوں گی۔ تو عقد کے "عوض" یعنی کمپنی کو ادا ہونے والی ممکنہ اقساط میں جہالت ہے۔

دوسرا کمپنی کب بیمہ دار کو بیمہ رقم ادا کرے، وہ حادثہ پر معلق ہے اور حادثہ کا وقت وقوع غیر معلوم ہے۔ لہذا رقم بیمہ کی ادائیگی کا وقت بھی مجهول ہے اور اس طرح اس معاہدہ کی مدت میں غریبہ۔

یہ عقد تمہارے بھی خالی نہیں چڑیکہ عقد بیمہ کی روح "خطرہ کا وقوع ہے چونکہ حوادث



کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ واقع ہوں گے یا نہیں اگر ہوں گے تو کب اور کس پیلنے پر۔ قمار کا مفہوم بھی یہی ہے۔ کیونکہ اس میں عاقدین معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک خاص واقعہ کے ہونے پر دوسرے کو متعین مقدار میں رقم ادا کرے گا۔ بیمہ کا مدار بھی اس نامعلوم اور مبہم نفع کی امید ہے جو بلاشبہ قمار میں داخل ہے۔

جیسے اوپر مثال میں ذکر کیا گیا کہ بسا اوقات صرف ایک سو کے ڈیسی کے موت واقع ہو جاتی ہے اور کل بیمہ رقم اس کے مقابل و شمار کو دی جاتی ہے۔ اس طرح ایک قسط کے بدلے پوری بیمہ رقم رہا سے برگرد خالی نہیں۔

دوسرا بیمہ کمپنی قسطوں سے حاصل شدہ رقم کو سودی کاروبار میں لگاتی ہیں اور اپنے زر کثیر کا بہت قبیل حصہ بونس یا نفع کی شکل میں دیا جاتا ہے جو بذات خود سود کے زمرے میں داخل ہے بعض لوگ اس منافع اور بونس کو کمپنی کی طرف سے تبرع اور احسان پرہ محمول کرتے ہیں یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ تبرع و احسان پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا اور یہاں عدالتی چارہ جوئی ہوتی ہے کمپنی تجارتی اغراض و مقاصد کے لئے یہ روپیہ بڑی چالاک سے جمع کرتی ہے اس طرح یہ ایک مفید ادارہ سرمایہ پرستوں کی حیلہ سازوں سے سودی کاروبار کو تقویت دینے کا سبب بن گیا۔

فحقی نقطہ نگاہ سے تیسری قسم بیمہ یعنی کمپنی بیمہ خواہ زندگی کا بیمہ ہو یا اشیا کا، بھری ہو یا بڑی غرہ قمار اور رہا سے خالی نہیں اور ان تین عناصر میں سے ہر ایک فساد عقد کے لئے کافی ہے، اور جو معاملہ ان تینوں پر مشتمل ہو وہ کیوں کہ شرعاً جائز ہو سکتا ہے۔ البتہ بیمہ کی پہلی دو صورتیں یعنی ریاستی اجتماعی بیمہ اور تبادلی بیمہ جیسے پہلے ذکر کیا ہے شرعاً ان میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ وہ واضح سرور سے پاک ہوں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ نظریہ کے اعتبار سے ایک مفید ادارہ ہے گو اس کی عملی شکل میں کچھ قباحتیں وجود میں۔ اگر ان قباحتوں کو نکال دیا جائے تو نظام بیمہ کی افادیت سے انکار نہیں یقیناً اس سے ایک عظیم معاشرتی خدمات سرانجام دی جا سکتی ہے۔

اجتماعی بیمہ کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ "ضمنان علی الودیعة بالاجبر" کے اصول پر پوسٹل انشورنس ایک اچھی سیکم ہے۔

پیشہ وادانہ اور محکمات انجمنیں تبادلہ بیمہ کا انتظام کر سکتی ہیں۔ مثلاً ڈرائیوروں کی انجمن ایسی بیمہ کی بنیاد ڈال سکتے ہیں جس میں ممبران خصوصاً چندہ ادا کریں اور کسی کو حادثہ درپیش آنے تو مجموعی اندوختہ میں سے نقصان کا تدارک کیا جائے نیز رہائشی ادارے اور خیراتی مراکز اس نوعیت کی بیمہ انجمنوں سے تعاون کریں۔

نجی بیمہ کمپنیاں بجائے سود کے شرکت اور مضاربت کی بنیاد پر اپنے کاروبار کو فروغ دیں یا ہمسداریوں کو اس بنیاد پر شریک بنائیں۔ اس ضمن میں مرکزی بیت المال اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ادارہ وقف سے بھی بیمہ کے مفاسد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں چونکہ سرکاری خزانہ میں دولت کی فراوانی تھی اور تمام تر ضروریات اور حادثات کو صورت مال تعاون کے وسیع تر ذرائع موجود تھے۔ اس لئے بیمہ ایسے نظام کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا، لیکن آج کے حالات مختلف ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ زکوٰۃ و صدقات جو حکومت وصول کرتی ہے اس سے جملہ نقصانات کا تدارک کیا جائے اس لئے نظام بیمہ مفید بنانے کی ضرورت ہے۔ بلکہ یہ تبادلہ، رہائشی اور اجتماعی بیمہ کاری کے سود، قمار اور غرر کے مفاسد سے پاک نظام بیمہ کو تعاون، ہمدردی کے اصولوں پر استوار کیا جائے۔

علماء معاشیات کا یہ فرض ہے کہ وہ اس اہم ضرورت کی طرف توجہ دیں اور اسلامی بیسازاری سے اس ادارہ کو مفید بنائیں :



## ادارہ تعلیمات اسلامیہ کے ترجمان "سوئے منزل" کے بارے میں چند اہم ارار

★ "سوئے منزل" وقت کی آواز ہے۔ اجاب کو چاہئے کہ بھرپور تعاون کریں

حکیم محمد موسیٰ امرتسری بانی مجلسِ فضاء لاہور

★ "رسلے کا ظاہر و باطن ایک سے ایک دن نواز، ہر مضمون میں دل کشی ہے، یہ سن انتخاب کی دلیل ہے"

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج ٹھٹھہ، سندھ

★ "سوئے منزل" کا معیار بہت بلند ہے۔ مضامین ہر لحاظ سے جامع اور دلچسپ ہیں۔ سید نور محمد قادری، بھارت

★ "آپ کا کام وقت کی ضرورت ہے، عدیم الفرستی کے باوجود اس مبارک اور بامقصد کام میں تعاون کرنا"

سید محمد ذوق القادری، گڑھی اختیار خان

★ "سوئے منزل" میں آپ نے جس مقصد کو پیش نظر رکھا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ پروفیسر آفتاب محمد نقوی، سیانکوٹ

★ "سوئے منزل" ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ محمد صادق قصوری، برج کلاں، قصور

★ "سوئے منزل" ایسے مضامین لئے ہوتے ہیں جو ہر صاحب ذوق کو دعوتِ شمولیت دیتے ہیں اور

اپنی نوعیت کے اعتبار سے خوب اور قابلِ قدر ہیں"

محمد منشا آتش قصوری، ایڈیٹر "ترجمان دین" مرید کے، شیخوپورہ

## "سوئے منزل"

ملازمتیڈ ریاض حسین شاہ ایم اے کی زیر نگرانی شائع ہونے والا دینی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا مجموعہ

آج ہی خریدار بنئے

سال بھر میں پانچ کاپیاں

سالانہ چندہ، دس روپے

قیمت فی کاپی، دو روپے صرف

شائع کرنے: ادارہ تعلیمات اسلامیہ (ترجمان) پوسٹ بکس نمبر ۸۶۹ راولپنڈی